مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ الامداد لاہور پاکستان

مدیر مسئول
(مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی

مدیر
ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

جلد ۲۱ | جمادی الثانی سنہ ۱۴۴۱ھ | فروری ۲۰۲۰ء | شمارہ ۲

تقلیل الکلام

کم گوئی

ازافادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات و حواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ =/۴۰ روپے | زرسالانہ =/۴۰۰ روپے

ماہنامہ الامداد لاہور

35422213
35433049

پتہ دفتر
جامعہ دار العلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ
۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ناشر: (مولانا) ڈاکٹر احمد میاں تھانوی
مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس
۲۰/۱۳ اریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور
مقام اشاعت
جامعہ دار العلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ لاہور پاکستان

وعظ

تقلیل الکلام
(کم گوئی)

بمقام مسجد خانقاہ امدادیہ تھانہ بھون ۲۱ رمضان المبارک ۱۳۴۰ھ بعد نماز جمعہ ساڑھے تین گھنٹے کھڑے ہوکر یہ وعظ ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد ۱۰۰ تھی ۔ مولانا ظفر احمد تھانوی صاحب نے قلمبند فرمایا۔

اس وعظ میں حکیم الامت نے مجاہدات کی چار اقسام تقلیل طعام، تقلیل منام، تقلیل کلام اور تقلیل اختلاط مع الانام میں سے تقلیل کلام پر بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ مجاہدات سے مقصود تسہیل اعمال ہے۔ اعمال کی روح اخلاص ہے اور کیفیات مقصود طریق نہیں ہیں۔ شریعت نے مجاہدات میں صرف ترک پر اکتفاء نہیں کیا بلکہ ساتھ ساتھ عمل بھی شروع کیا ہے تاکہ ترک سے غیر اللہ سے تعلق منقطع ہو اور عمل سے تعلق مع اللہ بڑھے۔

اللہ تعالیٰ تمام قارئین کو اس وعظ سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

خلیل احمد تھانوی

تقلیل الکلام
(کم گوئی)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱.....	مجاہدات حکمیہ کی چار قسمیں.....	۹
۲.....	اعتکاف سنت علی الکفایہ کا سبب.....	۱۰
۳.....	مجاہدات تسہیل اعمال کا ذریعہ ہیں.....	۱۱
۴.....	کیفیات مقصود طریق نہیں.....	۱۱
۵.....	خلوص روح اعمال ہے.....	۱۳
۶.....	وسوسہ کے ساتھ بھی ذکر نافع ہے.....	۱۴
۷.....	طلب خدا کی تفسیر.....	۱۶
۸.....	رضا کی طلب ہی طلب الٰہی ہے.....	۱۷
۹.....	جنت لوازم رضا سے ہے.....	۱۸
۱۰.....	ایک بزرگ کی حکایت.....	۱۹
۱۱.....	دشنام محبت.....	۲۰
۱۲.....	کیفیات کے مزے میں پڑنے کی نشانی.....	۲۱
۱۳.....	سوز و درد بھی قاصد ہے.....	۲۳
۱۴.....	عبادات کے مقبول ہونے کی علامت.....	۲۴
۱۵.....	اہل اللہ کے خذلان سے توفیق سلب ہوجاتی ہے.....	۲۶
۱۶.....	حصول مقصود میں لوگوں کے درجات.....	۲۷
۱۷.....	مختلف استعدادیں.....	۲۸
۱۸.....	ذات باری کے مخفی ہونے کی حکمت.....	۲۹
۱۹.....	استعداد کا اختلاف مسئلہ قدر کی طرف راجع ہے.....	۳۰

۲۰.......... اللہ تعالیٰ کے اسرار.. ۳۱
۲۱.......... اہل اللہ کو نعیم دنیا بلا مشقت ملتی ہے........................ ۳۳
۲۲.......... اہل زبان کی برابری کا دعویٰ غلط ہے........................ ۳۴
۲۳.......... گاؤں والوں کو خلوص مشکل سے حاصل ہوتا ہے......... ۳۵
۲۴.......... حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ کی حکایت............... ۳۷
۲۵.......... نیت کا اجر.. ۳۷
۲۶.......... ملاجیون کی حکایت.. ۳۹
۲۷.......... امور دین میں ہمت سے کام لینے کی ضرورت............ ۴۰
۲۸.......... زہد کے لیے ترک لذات کافی نہیں....................... ۴۲
۲۹.......... حضرت عیسیٰ و حضرت یحییٰ علیہما السلام کی قوت مردانگی........ ۴۲
۳۰.......... تمام کمالات میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جملہ انبیاء علیہم السلام سے افضل ہیں.. ۴۳
۳۱.......... حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کمال زہد..................... ۴۴
۳۲.......... حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نکاحوں میں حکمت......... ۴۴
۳۳.......... بیبیوں کے دو قسم کے تعلقات.............................. ۴۵
۳۴.......... ناز برداری کے ساتھ رعب کا جمع کرنا سرسری بات نہیں.. ۴۶
۳۵.......... سب ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ظاہری برتاؤ.. ۴۷
۳۶.......... حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حضرت عائشہؓ سے نکاح میں حکمت.. ۴۸
۳۷.......... ترک لذات زہد کے لیے لازمی نہیں.......................... ۵۰

۳۸.....	شکم سیر ہوکر کھانے سے روح صوم باطل نہیں ہوتی.....	۵۱
۳۹.....	ایک ماہ کا مجاہدہ اصلاح نفس کے لیے کافی ہے.....	۵۲
۴۰.....	ٹھنڈا پانی پینے میں حکمت.....	۵۳
۴۱.....	فکر موت کے ساتھ ایک بزرگ دین کی قوت کی گولی کا استعمال.....	۵۴
۴۲.....	علوم قلبی.....	۵۵
۴۳.....	حدیث انه لیغان علی قلبی کا مفہوم.....	۵۶
۴۴.....	روزہ میں شان تنزیہ کا ظہور ہے.....	۵۷
۴۵.....	اشکال وجواب.....	۵۹
۴۶.....	نماز میں شان عبدیت کا کامل ظہور ہے.....	۶۰
۴۷.....	تقلیل کلام کا مطلب.....	۶۱
۴۸.....	جریج عابد کی حکایت.....	۶۳
۴۹.....	عوام کے اعتقاد کا کچھ اعتبار نہیں.....	۶۶
۵۰.....	ضرورت کی تفسیر.....	۶۷
۵۱.....	روزہ میں تقلیل کلام کی صورت.....	۶۸
۵۲.....	رمضان میں ترغیب تلاوت کا راز.....	۷۰
۵۳.....	مثنوی مولانا روم رحمہ اللہ کی شوکت اور حلاوت.....	۷۲
۵۴.....	تلاوت قرآن کی صورت میں تقلیل کلام.....	۷۲
۵۵.....	قوت نطق بڑا جوہر ہے.....	۷۳
۵۶.....	تلاوت قرآن اور قوت گویائی.....	۷۳
۵۷.....	تحلیہ اور تخلیہ.....	۷۴
۵۸.....	حکماء یورپ اور حکماء یونان کا طریق علاج.....	۷۵

۵۹..... تحلیہ اور تخلیہ کی ساتھ ساتھ ضرورت..... ۷۶
۶۰..... حضرات نقشبندیہ وچشتیہ کا مذاق اختلاف..... ۷۷
۶۱..... شریعت مقدسہ میں تمام مجاہدات کی رعایت..... ۷۸
۶۲..... قلب کا بالکل خالی ہونا اچھا نہیں..... ۸۰
۶۳..... خلاصہ وعظ..... ۸۱
۶۴..... دعا..... ۸۱
۶۵..... اخبار الجامعۃ..... ۸۲

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریک لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ وبارک وسلم اما بعد:

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

(وَالَّذِیۡنَ جَاهَدُوۡا فِیۡنَا لَنَهۡدِیَنَّهُمۡ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ)(۱)

یہ وہی آیت ہے جس کی اس کے قبل دو دفعہ تلاوت کی گئی ہے اور آج پھر تلاوت کی گئی ہے کیونکہ اس کے ذیل میں جو مضمون بیان ہو رہا ہے وہ ابھی تمام نہیں ہوا۔

مجاہدات حکمیہ کی چار قسمیں

اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے۔ مجاہدات حکمیہ کی چار قسمیں ہیں: تقلیل طعام(۲)، تقلیل منام(۳)، تقلیل کلام(۴)، تقلیل اختلاط مع الانام(۵)۔ ان میں سے دو کا بیان ہو چکا ہے اور دو باقی ہیں اور جن دو کا بیان ہوا ہے وہ مستقلاً نہیں ہوا بلکہ اس حیثیت سے بیان ہوا کہ رمضان کی عبادت میں ان مجاہدات کی رعایت کی گئی ہے۔ اب دو جو باقی ہیں ان کی بھی اسی حیثیت سے تقریر ہوگی جن میں سے آج تقلیل کلام کے متعلق بیان کا ارادہ ہے اگرچہ بعض مقتضیات(۶) کی وجہ سے اس وقت تقلیل اختلاط مع الانام(۷) کا بیان ہونا چاہیے تھا کیونکہ یہ زمانہ اعتکاف کا ہے لیکن میں نے چند وجوہ سے تقلیل کلام(۸) کا بیان مقدم کیا۔

(۱) ''اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں برداشت کرتے ہیں ہم ان کو اپنے قرب وثواب (یعنی جنت کے) راستے ضرور دکھائیں گے، بے شک اللہ تعالیٰ کی (رضا ورحمت) ایسے خلوص والوں کے ساتھ ہے'' سورۃ العنکبوت:۶۹ (۲) کم کھانا (۳) کم سونا (۴) کم بولنا (۵) لوگوں سے کم ملنا جلنا (۶) بعض ترجیحات کی وجہ سے (۷) کم ملنا (۸) کم بولنا

اعتکاف سنت علی الکفایہ کا سبب

ایک یہ کہ اعتکاف ایک خاص وقتی عبادت ہے جس میں اتنا عموم ضرورت نہیں جتنا تقلیل کلام میں عموم ضرورت ہے(۱)۔ اعتکاف سب لوگ نہیں کرسکتے بلکہ اگر سب کرنا چاہیں تو ان کو منع کیا جائے گا کیونکہ اس سے حوائج وضروریات معطل(۲) ہوجائیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ اعتکاف سنت علی الکفایہ ہے(۳)۔ بستی بھر میں ایک آدمی اعتکاف کرلے تو کافی ہے اور تقلیل کلام(۴) کے مخاطب تمام افراد ہیں۔ فرداً فرداً اور اس پر سب کے سب عمل کرسکتے ہیں کیونکہ تقلیل کلام(۵) کی جو حقیقت آگے بیان کی جائے گی اس سے معلوم ہوجائے گا کہ اس پر سب کے عمل کرنے سے کسی ضرورت کا تعطل نہیں(۶) ہوسکتا۔ دوسرے تقلیل کلام کی رعایت جس عمل کے ضمن میں(۷) کی گئی ہے وہ عمل بھی بہ نسبت اعتکاف کے زیادہ عام ہے۔ چنانچہ آگے بیان کیا جائے گا کہ رمضان میں تلاوت قرآن کے ضمن میں تقلیل الکلام(۸) کی رعایت کی گئی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ عمل عام ہے تلاوت قرآن کرنے والوں کا عدد معتکفین سے بہت زیادہ ہے پھر یہ عمل ہر شخص کو اور ہر وقت سہل ہے اور اعتکاف ہر اک کو آسان نہیں نہ ہر وقت ہوسکتا ہے خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول بھی کثرت تلاوت کا تھا اور اعتکاف اس کثرت سے نہ کیا جاتا تھا۔ تیسرے خود قلت اختلاط(۹) اور قلت کلام میں فی نفسہ قلت کلام زیادہ ضروری ہے(۱۰) کیونکہ قلت اختلاط اگر نہ بھی ہو مگر تقلیل کلام(۱۱) کی عادت ہو تو غوائل(۱۲) سے بچ سکتا ہے اور اگر تقلیل کلام نہ ہو تو محض قلت اختلاط سے غوائل(۱۳) سے نہیں بچ سکتا جو شخص زیادہ بک بک کرنے کا عادی ہوتا ہے وہ ایک ہی مجلس میں بہت باتیں گناہ کی کہہ ڈالتا ہے۔ الغرض جن اعمال کے ضمن میں تقلیل کلام و تقلیل اختلاط کی رعایت کی گئی ہے خود ان اعمال میں بھی تفاوت ہے(۱۴)۔

---

(۱) اس کے بیان کی اتنی ضرورت نہیں جتنی کہ کم گوئی کو بیان کرنے کی ضرورت ہے (۲) ضروری حاجتوں میں خلل آئے گا (۳) چند لوگ کرلیں تو کافی ہے (۴) کم گوئی کا حکم سب کو ہے (۵) کم گوئی کی حقیقت (۶) کسی کی ضرورت نہیں رکتی (۷) کم گوئی کا حکم جس عمل کے تحت دیا گیا ہے (۸) تلاوت قرآن کے ذیل میں (۹) کم ملنے جلنے اور کم گوئی میں سے کم گوئی زیادہ ضروری ہے (۱۰) اگر کم بولنے کی عادت ہوگی تو زیادہ میل جول سے بری باتوں میں مبتلاء ہونے کا اندیشہ کم ہے اس سے بچ سکتا ہے (۱۱) اگر کم گوئی کی عادت نہ ہو تو صرف کم ملنے سے برائی سے نہیں بچ سکتا (۱۲) فرق۔

مجاہدات تسہیل (۱) اعمال کا ذریعہ ہیں

اور خود ان دونوں مجاہدوں میں بھی تفاوت ہے ان وجوہ سے میں نے تقلیل کلام کے بیان کو مقدم کیا لیکن مثل جمعہ گزشتہ کے اس وقت بھی مضمون سابق کا کچھ تتمہ ذہن میں آ گیا ہے اور وہ دو تتمے ہیں جن کو پہلے بیان کر دینا مناسب ہے میں نے پہلے بیان کیا تھا کہ شریعت نے محض اُن مجاہدات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کے ساتھ ساتھ اعمال بھی منقسم کر دیے گئے ہیں (۲) تا کہ معلوم ہو جائے کہ اصل مقصود اعمال ہیں اور مجاہدات تسہیل اعمال (۳) کا ذریعہ ہیں۔ پس اگر مجاہدہ کا ثمرہ حاصل نہ ہو یعنی کیفیات نہ ہوں اور اعمال موجود ہوں تو کافی ہے اور اگر اعمال نہ ہوں تو کیفیات کافی نہیں مثلاً ایک شخص نماز پڑھتا ہے روزہ رکھتا ہے زکوٰۃ دیتا ہے، بیوی بچوں کے حقوق ادا کرتا ہے، حرام آمدنی سے بچتا ہے کسی کا قرض لے کر نہیں مارتا، جھوٹ اور غیبت وغیرہ سے اجتناب (۴) کرتا ہے مگر اس کو وہ ثمرات حاصل نہیں جو مجاہدہ پر مرتب ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً غلبہ ذوق وشوق ویکسوئی وغیرہ نہیں تو یہ شخص بے فکر رہے اس کو مقصود حاصل ہے اور جو مفقود ہے وہ مقصود نہیں (۵) اس کا غم نہ کرے اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب اعمال کافی ہیں اور غلبہ ذوق وشوق ویکسوئی وغیرہ کی ضرورت نہیں تو طریق باطن کی کیا ضرورت ہے۔ اعمال تو ہم ویسے بھی کر سکتے ہیں اتنی بات کے لیے مشائخ کی خدمت اور مجاہدات وریاضت واذکار واشغال کی کیا ضرورت رہی یہ تو بدون (۶) اس کے بھی ہو سکتا ہے اس شبہ والے نے مقصود طریق ہی کو نہیں سمجھا، یہ شخص محض کیفیات ہی کو مقصود (۷) طریق سمجھتا ہے اسی لیے میرے اس کہنے پر کہ یہ کیفیات نہ ہوں تو بے فکر رہو اس کو طریق کے بیکار ہونے کا شبہ ہوا

سخن شناس نہ دلبرا خطا اینجا ست (۸)

کیفیات مقصود طریق نہیں

میں پھر کہتا ہوں کہ کیفیات مقصود طریق نہیں بلکہ مقصود طریق اعمال ہی نہیں اور یہ کیفیات خود ان اعمال کے تابع ہیں اگر عمل نہ ہو تو یہ کیفیات کبھی باقی نہیں رہ سکتیں،

(۱) اعمال میں آسانی کا (۲) مجاہدے کے ساتھ عمل کا بھی حکم دیا (۳) آسانی اعمال (۴) رکتا ہے (۵) جو حاصل نہیں وہ مقصود نہیں (۶) بغیر اسکے (۷) یہ شخص طریق کو نہیں بلکہ کیفیات کو مقصود سمجھتا ہے (۸) ''اے محبوب! غلطی تو یہ ہے کہ تو سخن شناس نہیں''۔

تجربہ کر کے دیکھ لیا جائے مگر جو اعمال مقصود طریق ہیں ان میں یہ شرط ہے کہ ان میں خلوص ہو۔ رہا یہ کہ پھر مقصود طریق کیا ہے تو سنئے کہ مقصود طریق اور خلوص فی الاعمال یہی باطن عمل ہے جس کے متعلق ارشاد ہے: ''وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ''(۱) اور حدیث میں ارشاد ہے: ''ان تعبداللّٰه كانك تراه''(۲) تو آپ نے میرے اس قول سے کہ اعمال کافی ہیں یہ مطلب سمجھا کہ محض ظاہری اعمال کافی ہیں اسی لیے طریق باطن کے بیکار ہونے کا شبہ ہوا حالانکہ میرا مطلب یہ تھا کہ اعمال مع اپنی صورت ظاہرہ اور مع اپنی روح کے موجود ہوں تو کافی ہیں(۳) اور روح اعمال خلوص ہے اور تجربہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس خلوص کے حصول میں طرق صوفیاء سے سہولت ہو جاتی ہے علم باطن میں ان ہی طرق کا بیان ہوتا ہے اور اسی کے لیے مشائخ کی صحبت اختیار کی جاتی ہے اور اسی کے لیے اذکار و اشغال(۴) بتلائے جاتے ہیں۔ اسی خلوص میں کیفیات ذوق وشوق و یکسوئی سے بھی سہولت ہو جاتی ہے لیکن خلوص ان پر موقوف نہیں خلوص اس کے بغیر بھی حاصل ہو سکتا ہے گو دقت اور مشقت سے ہی ہو مگر ہو سکتا ہے اور طریق باطن سے یہ بسہولت ہو جاتا ہے اور حقیقت اس خلوص کی یہ ہے کہ مثلاً نماز پڑھے تو اس میں ریاء نہ ہو، عجب نہ ہو، قصداً حضار وساوس نہ ہو(۵) تو اب اگر کوئی شخص نماز پڑھنے کھڑا ہوا اور سوائے رضائے حق کے اس کی کوئی غرض نہیں اور جو غرض بھی آتی ہے اس کو دفع کرتا ہے اور وساوس بھی دل میں خود نہیں لاتا تو یہ نماز خلوص کے ساتھ تمام ہوئی ہاں اگر یہ شخص کیفیات سے خالی ہے تو اس کے اہتمام اس کو مشقت بہت ہوگی لیکن اگر وہ اس مشقت کو برداشت کرتا رہے اور ہمت کر کے از خود نماز میں کوئی وسوسہ نہ لاوے نہ ریاء وعجب(۶) کو پاس آنے دے تو مقصود میں یہ شخص کامیاب ہے اور اس کو مشقت کی وجہ سے اجر بھی زیادہ ہوگا۔

(۱) ''حالانکہ ان لوگوں کو حکم ہوا تھا کہ اللہ کی اس طرح عبادت کریں کہ عبادت اسی کے لیے خاص رکھیں'' سورۃ البینۃ: ۵ (۲) ''تو اللہ کی عبادت اس طرح کر گویا تو خدا کو دیکھ رہا ہے'' (۳) ظاہری صورت اور روح کے ساتھ موجود ہوں (۴) ذکر و شغل کی تعلیم دی جاتی ہے (۵) ارادۃ وساوس نہ لائے خود بخود آنے کا کوئی نقصان نہیں (۶) دکھاوے اور خود پسندی

خلوص روح اعمال ہے

جس کی دلیل وہ حدیث ہے ’’ الذی یقرء القراٰن وھو بہ ماھر فھو مع السفرۃ الکرام البررۃ والذی یتعتع فیہ وھو علیہ شاق لہ اجران (۱) او کما قال۔ لیکن اس مشقت کا روزانہ برداشت کرنا آسان نہیں۔ بعض دفعہ آدمی گھبرا جاتا ہے اور نفس کو ڈھیل دے دیتا ہے تو نماز میں اول سے آخر تک وساوس ہی وساوس ہوتے ہیں کبھی عجب بھی پیدا ہوجاتا ہے، ریاء میں بھی مبتلا ہوجاتا ہے۔ سو طریق باطن کی تحصیل سے یہ مشقت باقی نہیں رہتی پھر حضور سہل ہوجاتا اور خلوص آسانی کے ساتھ حاصل ہوجاتا ہے تو طریق باطن بیکار نہ ہوا کیونکہ خلوص جو روح اعمال ہے وہ اس طریق سے بسہولت حاصل ہوجاتا ہے تو اب میرا یہ دعویٰ ثابت ہوگیا کہ اعمال کافی ہیں اور مقصود ہیں اور یہ بھی ثابت ہوگیا کہ طریق بیکار نہیں مقصود میں معین ہے اور برخلاف اس کے جب آدمی یہ عقیدہ کرلیتا ہے کہ کیفیات مقصود ہیں اور اعمال مقصود نہیں تو اس پر دو مفسدے (۲) مرتب ہوتے ہیں ایسا تو کون ہوگا جو نماز کو مقصود نہ سمجھے مگر مقصود بالذات وبالعرض میں کلام ہے بعض لوگ اعمال کو ان کیفیات کا وسیلہ سمجھتے ہیں اور مقصود بالذات کیفیات کو سمجھتے ہیں۔ اب ان کی حالت یہ ہے کہ نماز میں کیفیات حاصل ہوئی اور جی لگا تو سمجھتے ہیں کہ آج نماز پڑھی اور اگر جی نہ لگا تو سمجھے ہیں کہ نماز نہیں پڑھی مگر فرض کو تو ترک نہیں کرتے، فرائض کو تو گناہ کے خوف سے ادا کرلیتے ہیں لیکن جو اعمال مندوب (۳) ہیں جیسے تلاوت وذکر اور نوافل وغیرہ ان کو تو چھوڑ ہی بیٹھتے ہیں۔ چنانچہ تجربہ ہے کہ اکثر ذاکرین کی یہی حالت ہے کہ جب ذکر میں ان کا دل نہیں لگتا تو اس دن ذکر کا ناغہ کردیتے ہیں نوافل میں جی گھبرایا تو ان کو بھی چھوڑ دیتے ہیں یاد رکھو یہ حالت سخت خطرناک ہے اگر تم جی لگنے کے ایسے ہی تابع رہوگے تو شیطان تم کو ہمیشہ عبادات وذکر سے روکتا رہے گا، جب وہ دیکھے گا یہ شخص کثرت وساوس سے پریشان ہوکر کام ہی چھوڑ دیتا ہے تو وہ تمہارا پیچھا کبھی نہ چھوڑے گا اور تم کو اعمال سے معطل کردے گا ایسے

(۱) سنن ابی داؤد: ۱۴۵۴، کنز العمال: ۲۲۶۷ (۲) اس میں دو خرابیاں ہوتی ہیں (۳) مستحب

وقت میں وہی شخص کام کرسکتا ہے جو کیفیات کو مقصود نہ سمجھے عمل کو مقصود سمجھے وہ ہر حالت میں کام کرے گا خواہ دل لگے یا نہ لگے ان لوگوں نے ایک شعر یاد کر رکھا ہے جس کو اکثر واعظین وعظ میں پڑھا کرتے ہیں اور اس کو مولانا رومی کی طرف منسوب کرتے ہیں۔

بر زباں تسبیح دردل گاؤخر ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر (۱)

مگر میرے علم میں یہ مولانا کا شعر نہیں ہے مثنوی میں اس کا پتہ نہیں، غالباً بہاؤالدین عاملی کا شعر ہے اور وہ کوئی محقق نہیں، میرے نزدیک اس شعر کا مضمون بھی صحیح نہیں بلکہ تجربہ سے یہ ثابت ہوا ہے کہ ''ایں چنیں تسبیح ہم دارد اثر'' (۲)

وسوسہ کے ساتھ بھی ذکر نافع ہے

رات دن کا تجربہ ہے کہ ابتداء میں وساوس کی کثرت ہوتی ہی ہے بہت کم ذاکر ایسے ہوں گے جن کی ابتداء میں وسوسے نہ آتے ہوں مگر میں ذاکرین سے کہہ دیتا ہوں کہ اس طرف التفات نہ کرو، وساوس کے ساتھ ہی ذکر کرتے رہو رفتہ رفتہ حضور حاصل ہوجائے گا۔ چنانچہ وہ ذکر مع الوساوس (۳) ہی ایک نہ ایک دن اپنا اثر دکھاتا ہے اور زبانی تسبیح اپنا رنگ لاتی ہے اور حضور میسر ہوجاتا ہے۔ پس میں کیسے مان لوں کہ وسوسہ کے ساتھ ذکر نافع نہیں ہوتا، ہاں اگر اس شعر میں یہ تاویل کی جائے کہ جو شخص ذکر کے وقت خود وساوس کو جمع کر کے لاتا ہے تو ایسا ذکر مؤثر نہیں تو وہ شعر صحیح ہوسکتا ہے گو ذکر بیکار اب بھی نہیں ثواب تو ملے ہی گا کیونکہ زبان تو ذکر میں مشغول ہے مگر اس صورت میں قلب پر اس کا اثر نہ ہوگا۔ یہ قلب کو از خود دوسری طرف متوجہ کر رہا ہے تو ذکر کی طرف خاک توجہ ہوگی اور جب ذکر کی طرف متوجہ ہی نہیں ہوتا تو قلب پر اثر کیسے ہوگا لیکن اگر از خود وساوس نہیں لاتا بلکہ وساوس بلا قصداً (۴) آتے ہیں اور یہ ان پر التفات (۵) نہیں کرتا تو یہ ذکر نافع بھی ہے اور موثر بھی اور اس صورت میں وہ قول صحیح نہیں بلکہ اس کا نقیض صحیح ہے کہ ایں چنیں تسبیح ہم دارد اثر اور (۶) اگر وساوس مطلقاً مضر ہوتے اور اثر

(۱) ''زبان پر تسبیح ہے اور دل میں گائے اور گدھے کا دھیان ہے، اس طرح کی تسبیح کب اثر رکھتی ہے''
(۲) ''اس قسم کی تسبیح بھی مؤثر ہوتی ہے'' (۳) وسوسوں کے ساتھ ہی ذکر کرتے رہنا (۴) بلا ارادہ (۵) ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتا (۶) بلکہ اس کی ضد درست ہے کہ ایسی تسبیح کا بھی اثر ہوتا ہے

سے مانع ہوتے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے وساوس کی شکایت کی تھی آپ ان سے یہ کیوں فرماتے ہیں: ”اوجد تموہ قالوا نعم قال ذاك صريح الايمان “(۱) آپ فرماتے ہیں کہ کیا تم کو وسوسے آنے لگے اور تم نے ان کو اپنے اندر پالیا، صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا ہاں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ نے فرمایا کہ یہ تو خالص ایمان ہے مطمئن رہو جو لوگ ذکر میں جی نہ لگنے سے ذکر چھوڑ بیٹھتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کو خدا سے تعلق ہی نہیں اور اس کی طلب ہی نہیں ورنہ صاحب بھوکا آدمی کھانا سامنے آنے کے بعد یہ نہیں دیکھا کرتا کہ اس میں نمک ہے یا نہیں بھوکے کو مزے سے کیا بحث اسے تو کھانے سے کام ہاں جس کا پیٹ بھرا ہوا ہو اس کو یہ نخرے سوجھتے ہیں، اگر مزہ آیا کھالیا مزہ نہ آیا چھوڑ کر الگ ہو گیا، پس تم کو بھی اگر طلب اور بھوک ہوتی تو تم مزہ کو ہرگز نہ دیکھتے بلکہ تمہارا یہ مذاق ہوتا۔

فراق ووصل چہ باشد رضائے دوست طلب		کہ حیف باشد از وغیر او تمنائے(۲)

صاحب یہ تو خدا تعالیٰ کی طرف سے تمہارا امتحان ہے کہ ذکر میں لذت کے طالب ہو یا ہمارے طالب ہو اگر تم کو خدا سے تعلق اور عشق ہوتا اور اسی کی طلب ہوتی تو یہ حال ہوتا۔ ”گر مرادت رامذات شکر است“ (اگر تمہارے مراد کی لذت سکر کی طرح ہے) یعنی یہ مسلم (۳) لیکن ”بیمرادی ہم مراد دلبراست“ (لیکن نامرادی محبوب کی مراد ہے جو اس سے زیادہ لذیذ ہونی چاہیے) افسوس تم محبوب کی مراد پر اپنی مراد کو مقدم کرتے ہو، ارے جب وہی چاہتے ہیں کہ وساوس کے ساتھ ہی ہمارا ذکر کرو تو تم وساوس سے خالی ہونا کیوں چاہتے ہو اور ذکر کے لیے اس انتظار میں کیوں ہو کہ جی لگے تو کروں۔

بس زبون وسوسہ باشی دلا		گر طرب را با زدانی از بلا(۴)

جو شخص طرب اور تعب میں فرق سمجھے وہ ابھی تک وسوسہ نفسانی کا شکار ہے

ذاکر کو ہر حال میں اپنا کام کرنا چاہیے، خواہ طرب ہو یا تعب ہو(۵)

---

(۱) الصحیح لمسلم ب:۶۰، رقم: ۲۰۹، مجمع الزوائد: ۱/ ۳۴ (۲) ”فراق اور وصل کوئی چیز نہیں، رضائے دوست طلب کرو محبوب حقیقی کی رضا کے علاوہ کسی چیز کی طلب قابل افسوس ہے“ (۳) یہ بات تسلیم ہے (۴) ”یعنی اپنے دل میں برا وسوسہ ہے کہ تو عاشق ہو کر طرب اور تعب میں فرق کرتا ہے یعنی عاشق کو محبت کے راستے میں مشقت کو بھی لذیذ سمجھنا چاہیے“ (۵) خواہ لذت آئے یا مشقت ہو

فراق ووصل چہ باشد رضائے دوست طلب　　کہ حیف باشد ازو غیر او تمنائے (۱)

طلب خدا کی تفسیر

یہ شخص اس کو فراق سمجھتا ہے کہ لذت میں کمی ہوگی، سمجھتا ہے کہ بس میں مردود ہوگیا، ارے کیا کیفیت خدا ہے (۲) جس کے زوال سے یہ سمجھتا ہے کہ میں خدا سے دور ہوگیا جب یہ خدا نہیں تو پھر اس کے طالب کیوں ہوتے ہو، طالب خدا ہوکر غیر پر نظر افسوس کی بات ہے شاید یہاں کوئی ذہین یہ شبہ کرے کہ رضائے خدا کیا ہے، ظاہر ہے کہ خدا نہیں تو پھر تم رضا کے طالب کیوں ہوتم بھی طالب غیر خدا ہوئے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ رضا گو عین (۳) خدا نہیں مگر غیر بھی نہیں کیونکہ رضا صفات الٰہیہ میں سے ہے اور صفات لاعین لاغیر ہیں (۴) یہ تو اجمالی جواب ہے جو اہل علم کے مناسب ہے اور تفصیلی جواب یہ ہے کہ طلب خدا کی تفسیر یہی ہے کہ رضاء خدا کو طلب کرے (۵)۔ اِبْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ کے معنی یہی ہیں کہ ''ابتغاء مرضاة اللّٰه'' ہو چنانچہ حق تعالیٰ نے ایک مقام پر تو ''يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ'' فرمایا ہے اور دوسرے مقام پر ارشاد ہے: وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ۔ (۶) یہاں طلب رضاء کا حکم ہے معلوم ہوا کہ ابتغاء وجہ اللہ یہی ہے کہ رضاء الٰہی کا طالب ہو اور راز اس میں یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کی طلب بدون واسطہ صفات (۷) کے دشوار ہے کیونکہ ذات کا نہ تصور ہوسکتا ہے نہ اس کا حصول ہوسکتا ہے ذات کا تصور جب ہوگا صفات کے ہی واسطے سے ہوگا اور بلا واسطہ یعنی تصور بالکنہ اس کی ذات کا محال ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

در تصور ذات اورا گنج کو　　نادر آید در تصور مثل او (۸)

---

(۱) ''فراق اور وصل کوئی چیز نہیں، رضائے دوست طلب کرو محبوب حقیقی کی رضا کے علاوہ کسی چیز کی طلب قابل افسوس ہے'' (۲) کیا کیفیات خدا ہیں؟ (۳) اللہ کی خوشنودی (۴) صفات باری انا اللہ کی ذات کا عین ہیں اور نا اس سے جدا (۵) اللہ کی خوشنودی مانگو (۶) ''اور ان لوگوں کے خرچ کیے ہوئے مال کی حالت جو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی غرض سے کہ اپنے نفسوں کو اس عمل شاق کا خوگر بنا کر ان میں پختگی پیدا کریں، مثل حالت ایک باغ کے ہے جو کسی ٹیلہ پر ہو'' سورۃ البقرۃ: ۲۶۵ (۷) صفات کے واسطے کے بغیر مشکل ہے (۸) ''ہمارے تصور میں اللہ تعالیٰ کی ذات غیر محدود کیسے آسکتی ہے تصور میں جو کچھ آتا ہے وہ مثل ہے''

عارف شیرازی اسی کی نسبت کہتے ہیں:

عنقا شکار کس نہ شود دام باز چیں　　کیں جا ہمیشہ باد بدست است دام را(۱)

کسی شاعر نے اس مضمون کو اس طرح ادا کیا ہے:

برو ایں دام بر مرغ دگر نہ　　کہ عنقارا بلندست آشیانہ(۲)

رضا کی طلب ہی طلب الٰہی ہے

اسی واسطے عراقی اور غزالی نے ایک روایت نقل کی ہے جس کی تخریج عراقی نے ابونعیم اصبہانی سے کی ہے ''لا تفکروا فی اللّٰہ فانکم لن تقدروا قدرہ''(۳) یعنی خدا کی ذات میں تفکر نہ کرو تم اس کا احاطہ نہیں کرسکو گے تو جس ذات میں تصور بالکنہ محال ہے اس کی طلب بلاواسطہ کیونکر ہوسکتی ہے۔ پس رضا کی طلب یہی طلب خدا ہے اور اسی کی طلب کا امر بھی ہے اگر یہ کہو کہ جنت کی طلب کا بھی تو امر ہے اور وہ یقیناً غیر خدا ہے تو طلب غیر خدا جائز ہوئی تو پھر کیفیات کی طلب میں کیا حرج ہے اگر وہ طلب رضا کے برابر نہیں تو طلب جنت ہی کے مثل سہی اس کا جواب یہ ہے کہ اول تو جنت کی طلب کا امر(۴) درجہ مقصودیت میں نہیں بلکہ اس کا امر بھی طلب رضا ہی کے لیے ہے کہ جنت چونکہ محل رضا ہے اور رضا مقصود ہے اس لیے محل کو بھی طلب کرنا چاہیے۔ پس محل رضا کی طلب حقیقت میں رضا ہی کی طلب ہے اور اس کی دلیل یہ حدیث ہے۔ ''اللھم انی اسئلك رضاك والجنة واعوذبك من سخطك والنار''(۵) اس میں حضور ﷺ نے اول رضا کو طلب کیا پھر جنت کو کیونکہ وہ محل رضا ہے اور اول غضب الٰہی سے پناہ مانگی ہے پھر جہنم سے کیونکہ وہ محل غضب ہے۔ اس حدیث نے مطلع صاف کردیا کہ اصل مقصود رضا ہے اور جنت مقصود بالذات نہیں بلکہ محل رضا ہونے کی وجہ سے مطلوب ہے اسی کو مولانا فرماتے ہیں:

---

(۱) ''عنقا کا شکار کوئی شخص نہیں کرسکتا جال یہاں سے ہٹالے کہ عنقا کے شکار کی ہوس جس نے کی اس کے جال میں سوا ہوا کے کچھ حاصل نہ ہوا'' (۲) ''اے مخاطب جا اور جال کسی دوسری چڑیا کے لیے لگا کہ عنقا کا آشیانہ تیرے جال سے بہت بلند ہے'' (۳) حلیہ الاولیاء: ۶ ص ۶۷ (۴) طلب جنت کا حکم (۵) ''اے اللہ میں آپ سے آپ کی رضا اور جنت کا سوال کرتا ہوں اور میں آپ سے آپ کی ناراضگی اور دوزخ کی پناہ مانگتا ہوں''

بے تو جنت دوزخ است اے دلربا باتو دوزخ جنت است اے جانفزا(۱)

جنت لوازم رضا سے ہے

غرض جنت کو مقصود بالذات تو نہیں سمجھا(۲) جاتا بخلاف کیفیات کے کہ اکثر ذاکرین ان کو مقصود بالذات سمجھتے ہیں چنانچہ جی نہ لگنے کے وقت عمل کو چھوڑ دینا یا ذکر میں کمی کرنا اس کی علامت ہے اس پر مجھے انکار ہے باقی میں کیفیات کو بیکار تو نہیں کہتا ان سے عمل میں سہولت ضرور ہوجاتی ہے لیکن اگر وہ نہ ہوں تو عمل کیوں چھوڑا جائے، سہولت سے نہیں صعوبت (۳) ہی سے کرلے۔ سو ایک فرق تو طلب جنت وطلب کیفیت میں یہ ہوا۔ دوسرے خود جنت وکیفیات میں ایک فرق ہے اس لیے ان کو متماثل نہیں کہہ سکتے وہ یہ کہ جنت لوازم رضا سے ہے اسی لیے موعود ہے (۴) اور کیفیات لوازم رضا سے نہیں اس لیے موعود بھی نہیں (۵) تو اس کی مقصودیت سے بھی گھٹی ہوئی ہے اسی لیے اکابر نے فرمایا ہے کہ کیفیات محمود ہیں مقصود نہیں البتہ محمود یا معین مقصود ہونے کے سبب اگر ان کے لیے دعا کی جاوے تو اس کی طلب یعنی دعا کا حرج نہیں تو اعانت طاعت میں اس کا درجہ صرف اس قدر ہے کہ اس سے مقصود یعنی عمل میں قدرے سہولت ہوجاتی ہے جیسے چٹنی سے کھانا آسان ہوجاتا ہے لیکن ایسا کبھی نہ دیکھا ہوگا کہ دسترخوان پر چٹنی نہ ہو تو ضروری کھانا ہی چھوڑ دیا جاوے کیونکہ اصل مقصود تو غذا ہے چٹنی اس کے ہضم کے لیے معین ہے اس کو غذا کا موقوف علیہ نہیں بنایا جاتا بلکہ گاہے گاہے (۶) اگر دسترخوان پر چٹنی نہ آئے تو اچھا ہے تاکہ معدہ اس کا عادی ہوکر کمزور نہ ہوجائے اسی طرح گاہے گاہے کیفیات کا نہ ہونا بھی اچھا ہے تاکہ نفس ان کا عادی نہ ہوجائے پھر ان کے بغیر کام نہ کرے گا حالانکہ طالب کی شان یہ ہونی چاہیے کہ کیفیات کا نہ ہونا تو کیا اگر غیب سے یہ بھی آواز آجائے کہ تیرا عمل کچھ قبول نہیں تُو مردود ہے اور یقین ہوجاوے کہ یہ ندا غیبی ہے جب بھی اپنے کام میں لگا رہے اور ہرگز عمل کو ترک نہ کرے۔

(۱) ''اے محبوب تیرے بغیر جنت بھی مجھ کو دوزخ ہے اور اگر تو ساتھ رہے تو دوزخ بھی مجھے جنت ہے'' (۲) جنت اپنی ذات کے اعتبار سے مقصود نہیں بلکہ وہاں اللہ کی خوشنودی حاصل ہوگی اس لیے مقصود ہے (۳) مشقت ہی سے کرے (۴) رضاء الٰہی کے لوازمات میں سے ہے اس لیے اس کا وعدہ بھی کیا گیا (۵) وعدہ بھی نہیں (۶) کبھی کبھی

ایک بزرگ کی حکایت

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک شخص کا قصہ لکھا ہے کہ وہ مجاہدات بہت کرتا تھا، راتوں کو تہجد پڑھتا تھا مگر اس کو کیفیات تو کیا ہوتیں ایک دن غیب سے اس کو ایسا فضیحت (۱) کیا گیا کہ رات کو جب وہ تہجد کے لیے اٹھا تو ہاتف (۲) نے آواز دی کہ جو چاہے کر یہاں کچھ قبول نہیں اور یہ آواز اس زور سے آئی کہ اس کے ایک مرید نے بھی سن لی مگر وہ اللہ کا بندہ اس پر بھی اپنا کام پورا کر کے ہٹا، اگلی رات ہوئی تو پھر لوٹا بدھنا (۳) لیکر تہجد کو اٹھے مرید نے کہا اجی غیرت بھی کوئی چیز ہے جب وہ کچھ بھی قبول نہیں کرتے تو پھر کاہے کے لیے مصیبت جھیلتے ہو، پڑ کے سو بھی رہو، مرید کی اصلی رائے یہ نہ تھی کہ شیخ کام چھوڑ دے لیکن اپنے محسن کی حالت پر اس کا جی کڑھا اس لیے یہ بات منہ سے نکل گئی اس کو اپنے شیخ کی حالت پر رنج تھا اب شیخ کا جواب سنئے، واقعی طالب ایسے ہوتے ہیں کہ نہ آج کل جیسے کہ ایک دن نماز میں جی نہ لگا تو نہ تہجد ہے نہ ذکر ہے اس نے کہا بیٹا یہ تو معلوم ہے کہ وہ کچھ قبول نہیں کرتے مگر ان کے سوا میرے لیے کوئی دوسرا دروازہ بھی تو نہیں کہ ان کو چھوڑ کر وہاں چلا جاؤں، میرے لیے تو یہی ایک در ہے اسی پر جان دیدوں گا چاہے وہ قبول کریں یا رد کریں۔

تو انی ازاں دل پر داختن　　کہ دانی کہ بے او تواں ساختن (۴)

بس اس پر رحمت الٰہی کو جوش آ گیا اور دوبارہ ندا آئی۔

قبول ست گرچہ ہنر نیستت　　کہ جز ماپنا ہے دگر نیستت (۵)

اب بھی ایک چرکہ لگا دیا کہ ہنر تو کچھ نہیں مگر اس لیے قبول کر لیا کہ ہمارے سوا تیرے لیے پناہ کوئی نہیں مگر اس چرکہ کا مزا عشاق کے دل سے پوچھو ان کو اس پر وجد آتا ہے اور یوں کہتے ہیں:

---

(۱) شرمندہ کیا گیا (۲) غیبی آواز آئی (۳) وضوء کے پانی کا برتن (۴) ''اللہ تعالیٰ کے دروازہ سے بھاگ کر میں کہاں جاؤں بغیر اس دروازہ کے ہمارا کہاں اور ٹھکانا ہے'' (۵) ''سب قبول ہے اگرچہ ہنر نہیں ہے کہ ہمارے سوا تیرا اور کوئی ٹھکانہ بھی تو نہیں ہے''

بدم گفتی وخرسندم عفاک اللہ نکو گفتی جواب تلخ می زیبد لب لعل شکر خارا(۱)

دشنام محبت

ایک بزرگ کا قصہ لکھا ہے کہ وہ جب ذکر کے لیے بیٹھتے تو یہ آواز آتی کہ تو کچھ ہی کر مگر کافر ہوکر مرے گا، بڑے پریشان ہوئے، شیخ بڑی نعمت ہے ان کے شیخ زندہ تھے جاکر حال عرض کیا، شیخ نے فرمایا کہ اس آواز پر کچھ خیال نہ کرو یہ دشنام محبت ہے(۲) ان کی عادت ہے کہ عاشقوں کو یونہی پریشان کیا کرتے ہیں تم کام کئے جاؤ مگر وہ دشنام غلط (۳) نہیں ہوتی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے مزاح کے متعلق فرماتے ہیں: ''انی لا مازح ولکن لا اقول الا حقاً''(۴) کہ میں مزاح کرتا ہوں مگر مزاح میں بھی سچی ہی بات کہتا ہوں تو پھر حق تعالیٰ کی دشنام تو غلط کیونکر ہوسکتی ہے۔ بات یہ ہے کہ یہاں کافر سے معنی مشہور کافر باللہ مراد نہ تھے(۵) اور ان بزرگ نے معنی مشہور سمجھ کر ہی پریشانی ظاہر کی بلکہ یہاں کافر سے کافر بالطاغوت مراد تھا(۶)۔ چنانچہ یہ اطلاق قرآن شریف میں بھی وارد ہے: فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْ م بِاللّٰهِ(۷) اور یہ معنی اچھے ہیں مگر گول مول لفظ تھا اس لیے وہ بیچارے پریشان ہوگئے اور ایسی باتیں اس لیے فرمادیا کرتے ہیں کہ اس سے طالب کا امتحان ہوتا ہے کہ دیکھیں اب بھی کام میں لگا رہتا ہے یا چھوڑ کر الگ ہوجاتا ہے مگر یہ امتحان اپنے دیکھنے کے لیے نہیں ان کو تو سب کچھ معلوم ہے بلکہ دکھلاتے ہیں کن کو۔ ان کو جنہوں نے انسان کے متعلق کہا تھا: اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ(۸) کہ آپ زمین میں ایسے لوگوں کو خلیفہ بناتے ہیں جو اس میں فساد اور خونریزی کریں گے۔ ان کو دکھلاتے ہیں کہ دیکھ لو یہ مفسد کس شان کے ہیں یہ ہمارے کیسے طالب ہیں اور اسی لیے تبدیل ملائکہ کا وقت نماز کا وقت رکھا گیا۔ حدیث میں آتا کہ ملائکہ کی تبدیلی صبح اور عصر کی نماز کے وقت ہوتی ہے تاکہ ہر دن جاکر عرض کریں

(۱) ''آپ نے برا کہا اور میں خوش ہوں اللہ تعالیٰ آپ کو معاف کرے بہت اچھا کہا یہ تلخ جواب محبوب کے شیریں لبوں سے بہت ہی زیب دیتا ہے (۲) محبوب کا برا بھلا کہنا ہے (۳) لیکن وہ برا کہنا بھی غلط نہیں ہوتا (۴) مجمع الزوائد: ۹/۱۷، المعجم الکبیر للطبرانی: ۱۲/۳۹۱ (۵) اللہ کا منکر مراد نہیں تھا (۶) شیطان کا منکر مراد ہے (۷) '' جو شیطان کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائی سورۃ البقرۃ: ۲۵۶ (۸) سورۃ البقرۃ: ۳۰

''ربنااتیناھم وھم یصلون وفارقناھم وھم یصلون'' یعنی اے پروردگار ہم نے جا کر بھی تیرے بندوں کو نماز میں مشغول پایا اور آتے ہوئے بھی نماز میں چھوڑا وہ بیچارے گواہی دیتے دیتے تھک بھی گئے ہوں گے مگر پیچھا نہیں چھوڑا گیا، روزانہ ان سے سوال ہوتا ہے کہ ہمارے بندوں کو کس حال میں چھوڑا پھر عید اور عرفات کے موقع پر حق تعالیٰ مسلمانوں کے اجتماعی عبادت پر فرشتوں کے سامنے مباہات (۱) فرماتے ہیں کہ دیکھو میرے بندے جوق جوق کیسے چلے آتے ہیں اور جب مجالس وعظ میں جمع ہوتے ہیں تو فرماتے ہیں کہ دیکھو یہ مجھے کیسا پکار رہے ہیں یہ کیا چاہتے ہیں فرشتے عرض کرتے ہیں کہ یہ آپ کی رضا ومغفرت اور جنت کو طلب کرتے ہیں اور آپ کے غصہ وغضب اور جہنم سے پناہ مانگتے ہیں۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں گواہ رہو میں نے ان سب کو بخشا اور جو یہ مانگتے ہیں میں نے عطا کیا۔ اللہ ہماری ذراسی بات کی وہاں کیسی قدر ہوتی ہے اور فرشتوں کے سامنے کس طرح اس کو پیش کیا جاتا ہے تاکہ ہردن ان کو اپنے اس قول کا جواب ملتا رہے۔ ''اَتَجْعَلُ فِیْھَا مَنْ یُّفْسِدُ فِیْھَا'' (۲) الغرض کبھی کیفیات میں اس لیے کمی کردی جاتی ہے تاکہ طالب کا امتحان ہو اور اس امتحان سے اس کے اندر پستی پیدا ہوجاتی ہے کیونکہ اس کو مشاہدہ ہوجاتا ہے کہ میرے اختیار میں کوئی چیز نہیں سب کچھ حق تعالیٰ کے اختیار میں ہے اور پستی وہ چیز ہے جس سے معیت الٰہی بہت جلد حاصل ہوتی ہے۔

کیفیات کے مزے میں پڑنے کی نشانی

حدیث قدسی میں ارشاد ہے: '' انا عندالمنکسرۃ قلوبھم'' (۳) میں ان لوگوں کے پاس ہوں جن کے دل ٹوٹے ہوئے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح کیفیات کا ہونا نعمت ہے اسی طرح کسی وقت ان کا بند ہوجانا بھی رحمت ہے کیونکہ سلب کیفیات سے شکستگی قلب (۴) حاصل ہوتی ہے اور یہ شکستگی ترقی کا سبب ہے پس سالک کو کیفیات کے ہونے یا نہ ہونے کی پرواہ نہ کرنا چاہئیے جو شخص کیفیات ہی کے مزے میں پڑ جاتا ہے اس کی ایسی مثال ہے جیسے ایک شخص سفر کررہا ہو اور کسی خاص منزل پر پہنچنا

(۱) فخر (۲) ''کیا آپ پیدا کریں گے زمین میں ایسے لوگوں کو جو فساد کریں گے'' سورۃ البقرۃ: ۳۰
(۳) اتحاف السادۃ المتقین۔ ۶/ ۲۹۰ (۴) دل ٹوٹنا ہے

چاہتا ہو راستہ میں گرمی دوپہر کے وقت اسے ایک دریا ملا یہ اس میں گھسا تو وہاں ٹھنڈک پہنچی اب یہ اس میں سے نکلنا نہیں چاہتا، ٹھنڈ کی وجہ سے اسی میں رہنا چاہتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں راستہ طے نہیں ہوسکتا اور نہ یہ شخص منزل پر پہنچ سکتا ہے اس کے ساتھ ایک رفیق بھی تھا وہ دریا سے پار ہوگیا اور اس کو پکار رہا ہے کہ جلدی آ یہ کہتا ہے کہ میں تو دریا ہی میں رہوں گا اس نے آ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر نکال دیا اب خشکی میں آ کر اسے پھر پیاس اور گرمی معلوم ہوئی تو دریا کو یاد کر کے روتا ہے کہ ہائے میں وہاں سے کیوں نکال دیا گیا۔ رفیق کہتا ہے کہ کمبخت تو دریا میں نکل کر مقصود کے قریب ہوگیا اگر وہیں رہتا تو منزل پر کبھی نہ پہنچتا۔ اسی طرح سالک کے لیے گاہے گاہے کیفیات کا پیش آنا اس لیے ہے تاکہ کسی قدر کلفت سفر(۱) کم ہوجائے اور شدت کے بعد راحت مل جائے تاکہ آئندہ کے لیے ہمت تازہ ہوجائے لیکن اگر وہ اسی راحت میں رہنا چاہے تو یقیناً راستہ ہی میں رہ جائے گا اور مقصود تک نہ پہنچے گا تو تم کو کیفیات دے کر پھر سلب اس واسطے کرلیں تاکہ تم کو آگے بڑھا دیں نہ اس لیے کہ نیچے گرا دیں مگر تم رو رہے ہو کہ ہائے میری کیفیات کیا ہوئیں میں تو انہیں میں رہتا اس شخص کا وہ حال ہے جیسے کسی نے گدھر کو دیا تھا نمک، اس نے کہا میری آنکھیں ہی پھوڑ دیں، حق تعالیٰ تو تم کو آگے بڑھانا چاہتے ہیں مگر تم کیفیات میں پڑ کر راستہ ہی میں رہنا چاہتے ہو۔ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ جو کہ مجتہد فن اور مجدد وقت تھے، فرمایا کرتے تھے کہ یہ انوار و کیفیات حجاب نورانی ہیں اور حجاب نورانی حجاب ظلمانی سے اشد ہے۔ سالک کو یہ سب حجابات پس پشت ڈالنا چاہئیں ان کی طرف ہرگز التفات نہ کرے کیونکہ جس شخص کو بادشاہ سے ملنا ہے وہ نہ بھنگیوں کے مکان پر ٹھہرتا ہے نہ عطاروں کی دُکان پر ٹھہرتا ہے بلکہ سیدھا تخت شاہی پر پہنچنا چاہتا ہے تو حجاب ظلمانی تو بھنگیوں کے مکانات ہیں اور حجاب نورانی عطاروں کی دوکانات ہیں۔ سالک کو کسی پر توقف نہ کرنا چاہیے اس کو آگے چلتا رہنا چاہیے۔ مقصود وراء الوراء ہے۔

اے برادر بے نہایت در گہیست آنچہ بروے میرسی بروے مایست(۲)

(۱) سفر کی مشقت (۲) ''اے بھائی اللہ تعالیٰ کا راستہ غیر متناہی ہے پس اس راستے میں جس مقام پر پہنچ جاؤ اس پر ٹھہرنا مت، آگے بڑھ جانا تاکہ ترقی جاری رہے''

سوز و درد بھی قاصد ہے

اس بلا میں ہر زمانہ میں لوگ مبتلا ہوئے ہیں کہ کیفیات کو مقصود سمجھ کر عمل کو ان کے تابع کرتے تھے کہ ذرا کیفیات میں کمی آئی، عمل کو ترک کر دیا، مثنوی میں بھی مولانا نے ایک شخص کا قصہ لکھا ہے کہ وہ ذاکر شاغل تھا مگر اسے کچھ کیفیات وغیرہ حاصل نہ تھیں۔ شیطان نے اسے بہکایا کہ اندھیری کوٹھری میں ٹکریں مارتا ہے ادھر سے نہ کچھ پیام نہ سلام نہ کیفیات نہ واردات یہ عقلمند تہجد اور ذکر وغیرہ سب چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ گیا کہ واقعی اتنے دن کام کرتے ہو گئے ادھر سے کچھ جواب ہی نہیں، رسید ہی نہیں ملتی، یہ شخص مراد کا مقام رکھتا تھا، اس لیے حق تعالیٰ کی طرف سے اس کو تنبیہ کی گئی۔ مرید اور مراد میں فرق یہ ہے کہ مرید ابھی تک عاشق ہی ہے محبوب نہیں بنا اور مراد عاشق بھی ہے محبوب بھی، مرید اعراض کرے تو یہ کہہ کر دھکے دیدیئے جاتے ہیں:

ہرکہ خواہد گو بیاؤ ہرکہ خواہد گو برو دارو گیر حاجب و دربادریں درگاہ نیست (۱)

اور مراد اعراض کرے تو اس کو پکڑ کر بلواتے ہیں کیونکہ وہ محبوب بھی ہے جیسے خوبصورت مرغ وحشی کہ وہ بھاگتا ہے مگر دانہ دکھلا کر اس کو جذب کرتے ہیں ایسے ہی محبوب کا قول ہے:

مرغ باغ ملکوتیم دریں دیر خراب میشود نور تجلائے خدا دانہ ما (۲)

تو جب یہ شخص سب کام چھوڑ کر سو رہا تو حق تعالیٰ کی طرف سے حضرت خضر علیہ السلام کو یا کسی فرشتہ کو حکم ہوا کہ اس احمق کو سمجھاؤ کہ وہ نماز و ذکر وغیرہ کو چھوڑ کیوں بیٹھ رہا وہ خواب میں آئے اور پوچھا کہ بھائی تو آج کیوں سو رہا اس نے وہی شکایت کی کہ اتنے دن کام کرتے کرتے ہو گئے وہاں سے کوئی رسید ہی نہیں ملتی۔ نہ سوال ہے نہ جواب اس لیے میں نے سب چھوڑ دیا۔ جواب ارشاد ہوا:

گفت آں اللہ تو لبیک ماست دین نیاز و سوز و دردت پیک ماست (۳)

---

(۱) ''جو شخص آنا چاہے تو کہہ دو آجائے اور جو جانا چاہے تو کہہ دو وہ چلا جائے'' (۲) ''میں عالم ملکوت کی چڑیا ہوں اس دنیا میں ہمارا دانہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات کے انوار ہیں'' (۳) ''فرمایا کہ اے بندہ تیرا اللہ کہنا ہمارا لبیک ہے اگر تیرا پہلا اللہ قبول نہ ہوتا تو دوسری بار توفیق دوسرے اللہ کی نہ ہوتی یہ نیازمندی اور سوز و گداز کی توفیق ہماری طرف سے قاصد ہیں''

یہ تیرا اللہ اللہ کرنا ہی ہمارا جواب ہے اگر ہم کو تیرا ذکر پسند نہ ہوتا تو ہم تیری زبان سے اپنا نام نکلنے نہ دیتے بلکہ زبان پکڑ لیتے جس سے ایک دفعہ بھی اللہ نہ نکل سکتا بس ایک بار اللہ کہہ کر جب دوبارہ اس کے نام کی توفیق ہوئی تو سمجھ لو کہ پہلا قبول ہو گیا اور یہی دوسرا ہماری طرف سے جواب ہے علیٰ ہذا تمہارے دل میں جو سوز و درد ہے یہ ہماری طرف سے قاصد ہے اگر ہم کو تعلق نہ ہوتا تو اپنا قاصد تیرے پاس نہ بھیجتے کیونکہ ہمارا قاصد ہر شخص کے پاس نہیں جایا کرتا بلکہ جہاں ہم بھیجنا چاہتے وہیں جاتا ہے اور یہ کیا ضرور ہے کہ قاصد عربی ہی بولتا آوے یہ سوز و درد بھی قاصد ہے یہ وہ سکینہ ہے جس کے متعلق ارشاد ہے: ''هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ''(۱) اور ذکر کے وقت یہ سکینہ ضرور نازل ہوتا ہے۔ یقیناً ذکر سے پہلے قلب کی جو حالت تھی ذکر کرنے کے بعد وہ حالت نہ ہوگی بلکہ کچھ اور حالت ہوگی یہ اسی سکینہ کا اثر ہے جس سے ذکر کے بعد دل میں کبھی ایک ٹھنڈک سی معلوم ہوتی ہے کبھی درد و سوزش محسوس ہوتی ہے یہ سب خدائی قاصد ہیں ان کو بیکار نہ سمجھو۔ اسی کو فرماتے ہیں:

گفت آں اللہ تو لبیک ماست دیں نیاز و سوز شد و دت پیک ماست (۲)

عبادات کے مقبول ہونے کی علامت

اس مضمون کو ہمارے حضرت حاجی صاحب نے ایک بار اس طرح بیان فرمایا کہ اگر ایک آدمی تمہارے گھر پر روزانہ آتا ہو اور تم کو اس کے روک دینے کی قدرت ہو تو اگر تم کو اس کا آنا ناگوار ہوگا تو تم اس کو صاف صاف روک دو گے کہ آپ یہاں نہ آیا کریں مجھے تکلیف ہوتی ہے اور اگر باوجود قدرت کے تم اس کو نہ روکو تو یہ اسکی علامت ہے کہ اس کا آنا تم کو ناگوار نہیں بلکہ تم اس کا آنا چاہتے ہو اسی طرح اگر حق تعالیٰ کو تمہارے مسجد میں آنا اور نماز پڑھنا پسند نہ ہوتا وہ تم کو خود روک دیتے مگر جب پانچ وقت مسجد میں آنے کی اور نماز میں اپنے سے بات چیت کرنے کی تم کو توفیق دے رکھی ہے تو

(۱) ''وہی (باری تعالیٰ) جس نے مؤمنین کے قلوب میں سکینہ نازل فرمائی'' سورۃ الفتح: ۴ (۲) ''فرمایا کہ اے بندہ تیرا اللہ کہنا ہمارا لبیک ہے اگر تیرا پہلا اللہ قبول نہ ہوتا تو دوسری بار توفیق دوسرے اللہ کی نہ ہوتی یہ نیازمندی اور سوز و گداز کی توفیق ہماری طرف سے قاصد ہیں''

سمجھ لو کہ تمہارا آنا ان کو ناگوار نہیں ہے اور تمہاری عبادات خدا کے یہاں مقبول ہیں، رہا یہ کہ حق تعالیٰ اگر روکنا چاہیں تو کس طرح روکیں گے کیا وہاں سے کوئی سپاہی آئے گا ہاں وہ اس طرح روک دیں گے کہ تم کو نماز کی توفیق ہی نہ ہوگی، وہ سپاہی یہی ہے جیسے ایک آقا اور غلام کا قصہ ہے کہ غلام آقا کے ساتھ بازار میں گیا راستہ میں نماز کا وقت آ گیا، غلام نمازی تھا وہ آقا سے اجازت لے کر مسجد میں نماز کے لیے گیا اور آقا صاحب مسجد کے باہر بیٹھ گئے، اب تمام نمازی نماز پڑھ کر مسجد سے جا رہے ہیں مگر غلام باہر ہی نہیں آتا، اس نے اطمینان سے فرض پڑھے، پھر نفلیں شروع کر دیں پھر وظیفہ میں لگ گیا جب بہت دیر ہوگئی تو آقا نے آواز دی کہ میاں اتنی دیر کہاں لگادی، باہر کیوں نہیں آتے، غلام نے کہا کہ آنے نہیں دیتے کہا کون نہیں آنے دیتے، کہا جو تم کو اندر نہیں آنے دیتا وہ مجھ کو باہر نہیں آنے دیتا۔ واقعی جب ان کو کسی کا مسجد میں آنا ناگوار ہوتا ہے تو اس کو مسجد میں قدم رکھنے کی بھی توفیق نہیں ہوتی، بہت لوگ برسوں مسجد کے دروازے پر کباب بنا کر بیچتے ہیں مگر ایک دن بھی مسجد کے اندر جانے کی توفیق نہیں ہوتی یہ ہے ان کا روکنا وہ اس طرح روکا کرتے ہیں پس جن کو پانچوں وقت نماز کی توفیق ہو رہی ہے وہ امید رکھیں کہ ان شاء اللہ تعالیٰ ان کی عبادات مقبول ہو رہی ہیں۔ گو ہماری عبادات اس قابل تو نہیں ہیں مگر محض رحمت سے قبول ہو جاتی ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

ایں قبول ذکر تو از رحمت است چوں نماز مستحاضہ(۱) رخصت است(۲)

کیا غضب کی مثال ہے کہ جس طرح مستحاضہ عورت حقیقت میں ناپاک ہے مگر شریعت اسی حالت میں اس کو نماز کی اجازت دیتی ہے اور احکام میں اس کو پاک شمار کر لیتی ہے اسی طرح ہماری عبادات گو حقیقت میں ناقص ہیں مگر حق تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کو قابل بنا کر قبول فرما لیتے ہیں اگر قبول نہ فرماتے تو اس کی توفیق نہ دیتے، ہمارے

(۱) استحاضہ اس خون کو کہتے ہیں جو عورت کو بوجہ بیماری مسلسل آتا ہے اس کی وجہ سے نماز معاف نہیں جیسے حیض ونفاس میں معاف ہے۔ مستحاضہ باوجود خون آتے رہنے کے ہر نماز کے لیے وضوء کرے اور نماز پڑھ لے اس کی نماز قبول ہے (۲) ''تمہارے ذکر کا قبول ہونا محض اللہ تعالیٰ کی رحمت سے ہے جس طرح استحاضہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی اجازت ہے اور شریعت کے احکام نے اس کو پاک قرار دیا ہے''

حضرت حاجی صاحب کے پاس ایک ذاکر شخص آئے اور آکر عرض کیا کہ حضرت میں نے طائف میں چلہ کیا تھا، روزانہ سوالاکھ مرتبہ ذکر کرتا تھا مگر نفع نہیں ہوا شاید حضرت مجھ سے کچھ ناراض تھے جو نفع نہ ہوا۔ حضرت کو جوش آیا اور فرمایا کہ میاں اگر ہم ناراض ہوتے تو سوالاکھ مرتبہ ذکر کی توفیق ہی نہ ہوتی اور تم جو نفع کی شکایت کرتے ہو تو کیا یہ نفع نہیں ہے کہ زبان سے سوالاکھ دفعہ اللہ اللہ نکلتا تھا۔

اہل اللہ کے خذلان سے توفیق سلب ہوجاتی ہے

صاحبو! جب اہل اللہ کے خذلان (۱) سے توفیق سلب ہوجاتی ہے تو خدا تعالیٰ کے خذلان کے بعد تو ہم کیا کرسکتے ہیں، کچھ بھی نہیں حضرت نے سچ فرمایا کہ اگر حق تعالیٰ نہ چاہیں تو ایک مرتبہ بھی زبان سے اللہ نہیں نکل سکتا، مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ایک مقام پر دعا کے بارے میں فرماتے ہیں:

ہم دعا از تو اجابت ہم زتو ایمنی ازتو مہابت ہم زتو (۲)

واقعی دعا کی توفیق بھی حق تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے اگر وہ توفیق نہ دیں تو ہماری زبان سے دعا بھی نہیں نکل سکتی یہ ساری گفتگو اس ذاکر کے قصہ پر چل پڑی تھی کہ اس کو شیطان نے بہکایا تھا کہ جب نہ کیفیات ہیں نہ واردات ہیں نہ خطاب ہے نہ جواب ہے تو اندھیری کوٹھری میں ٹکریں مارنے سے کیا فائدہ اور اس نے اس وسوسہ کی وجہ سے تہجد و ذکر چھوڑ دیا تھا، یہ قصہ اس پر نقل کیا تھا کہ کیفیات کو مقصود سمجھنے کی غلطی میں ہر زمانہ میں لوگ مبتلا ہوئے ہیں ایک مفسدہ (۳) کیفیات کے مقصود سمجھنے میں پہلے کا عکس ہے یعنی بعض لوگ کیفیات کے حصول کے بعد عمل کو چھوڑ دیتے ہیں جب تک کیفیت حاصل ہے اس وقت تک عمل کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ یہ مطلب نہیں کہ فرائض کو بھی چھوڑ دیتے ہیں یہ تو ملحدین کرتے ہیں ان سے اس وقت بحث نہیں جو لوگ اہل حق ہیں وہ فرائض تو ترک نہیں کرتے مگر حصول کیفیات کے بعد ذکر و نوافل و تلاوت قرآن وغیرہ

(۱) اہل اللہ کی ناراضگی (۲) ''دعا کی توفیق بھی اے خدا آپ ہی کی طرف سے ہے اور قبولیت بھی آپ ہی کی طرف سے ہے، امن اور سکون کا احساس بھی آپ کی طرف سے ہے اور خوف و ہیبت بھی آپ کی طرف سے ہے'' (۳) ایک خرابی

کو چھوڑ بیٹھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مقصود تو حاصل ہی ہے پھر اتنی مشقت کی کیا ضرورت ہے کہ چھ ہزار دفعہ ذکر اسم ذات کریں یا تہجد کے لیے اٹھیں اب تو ملکہ یا دداشت حاصل ہوگیا ہے اب تو ہمارا سونا بھی ذکر ہے سو جب تک کیفیت ہے اس وقت تک عمل ہی نہیں کرتے اور جب کیفیت نہ رہی اب پھر ذکر و شغل اور تہجد وغیرہ شروع کر دیتے ہیں غرض ان لوگوں کے دل میں عجیب عجیب موجیں اٹھتی ہیں کوئی تو کیفیت کے نہ ہونے سے عمل میں کمی کرتا ہے اور کوئی اس کے ہونے سے عمل میں کوتاہی کرتا ہے اور نہ ہو تو پھر کوشش کرتا ہے یہ شخص بھی کیفیت ہی کو مقصود سمجھتا ہے چونکہ وہ عمل ہی سے پیدا ہوئی تھی اس لیے سلب کیفیت یا قلب کیفیت (۱) کے وقت عمل کا اہتمام کرتا ہے یہ بھی غلطی پر ہے، بس راستہ پر وہ شخص ہے جو عمل ہی کو مقصود سمجھتا ہے اور کیفیت ہو یا نہ ہو ہر حال میں عمل پر دوام (۲) رکھتا ہے۔

حصول مقصود میں لوگوں کے درجات

یہ مسئلہ میں نے اس لیے بھی ظاہر کیا ہے تاکہ مزدوری پیشہ اور کھیتی کرنے والے یہ نہ سمجھیں کہ ہم بھلا کیا ذکر کریں ہمیں یہ حالات کیا پیش آئیں گے سو خوب سمجھ لو کہ واللہ مقصود تم کو بھی حاصل ہوسکتا ہے کیونکہ مقصود سب طرق سے خلوص ہے (۳) جو بدون (۴) ان کیفیات وحالات کے بھی حاصل ہوسکتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ مقصود ان گردن جھکانے والے (۵) صوفیوں کو یکسوئی کے سبب سہولت کے ساتھ حاصل ہوجاتا ہے اور تم کو ذرا دقت سے اور دیر میں حاصل ہوگا اور سہولت کا وعدہ کیسے کرلوں اتنا تو میں نے تم سے اناج (۶) بھی وصول نہیں کیا جو تمہاری خاطر صحیح بات کو غلط کردوں اور یہ کہہ دوں کہ تم کو بھی اسی سہولت سے مقصود حاصل ہوجائے گا جس صورت سے خانقاہ میں پڑ مرنے والوں کو حاصل ہوتا ہے نہ بھائی ان کے برابر تو سہولت نہ ہوگی مگر ایسے وقت بھی نہ ہوگی جس کو تم برداشت نہ کرسکو، بس اتنا ہی فرق ہوگا کہ اگر ان کو سال بھر میں مقصود

(۱) اس حالت کے ختم ہونے یا بدل جانے کے وقت (۲) ہمیشہ عمل کرتا رہتا ہے (۳) سب طریقوں سے مقصود اخلاص ہی ہے (۴) بغیر (۵) مراقبہ کرنے والے (۶) گندم۔

حاصل ہوجاتا ہے تو تم کو دوسال تین سال میں حاصل ہوگا اور ان کو دوسال میں ہوگا تو تم کو چار سال میں ہوگا۔ اور یہ بات ہے کہ ہر شخص اپنے بچھڑے کے دانت خوب جانتا ہے اسی طرح حق تعالیٰ اپنے بندوں کو خوب جانتے ہیں انہوں نے ہر شخص کے مناسب اس کے اندر استعداد رکھی ہے چنانچہ اسی بناء پر خدا تعالیٰ نے تم کو ظاہری رزق بھی مشقت سے دیا ہے کہ جو ہل جوتتے ہو کھیت میں پانی دیتے ہو زمین کو درست کرتے ہو گرمی اور بارش کی تکلیف اٹھاتے ہو تب روٹی ملتی ہے۔ اسی طرح باطنی رزق بھی تم کو مشقت سے ملے گا یہاں بھی تم کو خانقاہ والوں سے زیادہ محنت کرنی پڑے گی، جب مقصود حاصل ہوگا تمہارے لیے اسی میں مصلحت ہے۔ حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب رحمہ اللہ نے تفسیر مظہری میں ایک حدیث قدسی نقل کی ہے جس کی تخریج مجھ کو یاد نہیں رہی اور وہ تو اگر تخریج بھی نہ کرتے تب بھی وہ بیہقی وقت ہیں۔ حدیث پر ان کی بہت نظر ہے بدون ثبوت کے حدیث نہیں لکھتے اس لیے ہمیں ان کی محض نقل پر بھی اعتماد ہوتا ہے۔ حدیث کا مضمون یہ ہے کہ میرے بعضے بندے بیماری میں مومن رہتے ہیں اگر میں ان کو تندرست کردوں بغوائی الارض تو وہ زمین میں فساد برپا کردیں، میرے بعضے بندے تکلیف ومشقت میں مومن رہتے ہیں اگر میں ان کو راحت دیدوں تو وہ کافر ہوجائیں، میرے بعض بندے راحت ہی میں مومن رہتے ہیں اگر میں تکلیف میں رکھوں گا تو کافر ہوجائیں تو گاؤں والوں کے لیے خدائے تعالیٰ نے مشقت ہی کی استعداد رکھی ہے کہ ان کو رزق ظاہر ورزق باطن دونوں مشقت سے ملتے ہیں باقی یہ سب استعدادیں انہیں کی پیدا کی ہوئی ہیں کسی کو ان کی لم دریافت (۱) کرنے کا حق نہیں کہ فلاں میں یہ استعداد کیوں رکھی فلاں میں کیوں نہیں رکھی۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسدز باغباں بلبل چہ گفت وگل چہ شنید وصبا چہ کرد (۲)

مختلف استعدادیں

اس میں حق تعالیٰ کی حکمتیں ہیں کہ ہر شخص میں مختلف استعداد رکھی ہے یہ مسئلہ

(۱) اسکی وجہ (۲) ''یہ کس کا دماغ ہے کہ باغبان سے پوچھے کہ بلبل نے کیا کہا اور گل نے کیا سنا اور صبا نے کیا کام کیا''

قدر کے متعلق ہے اور عارفین نے فرمایا ہے کہ دو چیزیں ایسی ہیں جن کی حقیقت جنت میں بھی منکشف نہ ہوگی ایک مسئلہ قدر دوسرے کُنہِ ذات۔ اور اصل میں مسئلہ قدر کا انکشاف بھی وہاں نہ ہوگا اور یہ مسئلہ عدم ادراک کنہ ذات حدیث میں بھی مذکور ہے مگر ملاحسن (۱) کی اصطلاحات میں مذکور نہیں اسی لیے طلبہ کی نظر وہاں تک نہیں پہنچتی کیونکہ یہ تو ہر بات کو اصطلاحات معقول میں سمجھنا چاہتے ہیں مگر حدیث کی اصطلاحات ملاحسن کی اصطلاحات سے جدا ہیں۔

ذات باری کے مخفی ہونے کی حکمت

سنئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تجلی جنت کے باب میں فرماتے ہیں ''لا یبقیٰ علی وجھہ الا رداء الکبریاء'' اس کا بھی وہی مطلب ہے کہ بجز کنہ ذات مخفی (۲) ہونے کے وہاں اور کوئی حجاب نہ رہے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کنہ ذات کو کبریا سے تعبیر فرمایا کیونکہ کبریاء وعظمت اس کے لیے لازم ذات ہے (۳) اور کنہ ذات کا مخفی رہنا یہ اعلیٰ درجہ کی عظمت ہے (۴) تو یہ لازم اس سے منفک (۵) نہ ہوگا اس لیے وہاں دیدار تو ہوگا اور حق تعالیٰ بے پردہ اس طرح ظاہر ہوں گے جیسے چاند کھلا ہوا ہو مگر ایک پردہ جلال وکبریا کا باقی رہ جائے گا جس کی وجہ سے ہم احاطہ حسن الٰہی کا نہ کرسکیں گے کیونکہ وہ غیر محدود ہے اور ہم محدود ہیں اور محدود غیر محدود کا احاطہ نہیں کرسکتا اس لیے یہ حجاب باقی رہے گا اور یہ راز تو تحقیقی ہے اور ایک راز عاشقانہ ہے وہ یہ کہ اگر کوئی حجاب باقی نہ رہتا اور خدا کا حسن بھی محبوبان دنیا کے حسن کی طرح محدود ہوتا تو چند روز میں جی بھر جاتا جیسا کہ محبوبان دنیا سے جی بھر جاتا ہے کیونکہ ان کا حسن محدود ہوتا ہے اور ہمارا تمتع بھی محدود ہوتا ہے۔ اگر خدا کا حسن بھی ایسا ہی ہوتا اور غیر محدود نہ ہوتا تو کچھ مدت کے بعد لوگ جنت سے گھبرا کر وہاں سے نکلنے کی تمنا کرتے جیسے ایک اندھے حافظ جی کا قصہ ہے کہ ان کو حوروں کی بہت تمنا تھی، روز دعا کرتے تھے کہ اے اللہ حور کو بھیج دے، پڑوس میں چند فاحشہ عورتیں

(۱) کتاب کا نام ہے جس میں منطقی اصطلاحات مذکور ہیں (۲) ذات باری کی حقیقت کے پوشیدہ ہونے کے سوا (۳) ذات باری کا خاصہ ہے (۴) ذات باری کی حقیقت کا پوشیدہ رہنا ہی بڑی عظمت کی دلیل ہے (۶) جدا

رہتی تھیں انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اندھا روز حور کی دعا کرتا ہے لاؤ آج اس سے مذاق کریں اور حوروں کا مزہ چکھائیں، ہم میں سے ایک ایک اس کے پاس جائے کہ حافظ جی میں حور ہوں، مجھے خدا نے بھیجا ہے، چنانچہ پہلے ایک آئی اور کہا حافظ جی میں حور ہوں مجھے خدا نے بھیجا ہے، آپ کی دعا قبول ہوگئی، حافظ جی بڑے خوش ہوئے اور اس سے منہ کالا کیا، وہ نکلی تو دوسری پہنچی خیر حافظ جی اس سے بھی مشغول ہوئے، پھر تیسری پہنچی پھر بھی کچھ ہمت کی، اب چوتھی پہنچی پھر پانچویں پہنچی تو حافظ جی حوروں کو گالی دے کر گھبرا کر کہتے ہیں کہ کیا ساری حوریں میرے ہی حصے میں آگئیں، جاؤ اب کسی اور کے پاس جاؤ مجھے حور نہیں چاہیے، میں حوروں سے باز آیا، حافظ جی کی اس بات پر کہ مجھے حور نہیں چاہیے ایک اور حکایت یاد آئی۔

استعداد کا اختلاف مسئلہ قدر کی طرف راجع ہے

ایک شخص کی عادت تھی کہ وہ جنگل میں ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر روز دعا کرتا تھا کہ اے اللہ مجھے کھینچ، ایک مسخرے نے سن لیا اس نے اس کی اصلاح کرنی چاہی، ایک دن درخت کے اوپر ایک مضبوط رسی لے کر بیٹھ گیا۔ جب اس شخص نے دعا کی اے اللہ مجھے کھینچ تو اس نے رسی میں پھندا بنا کر لٹکا دیا اور آواز بنا کر کہا کہ میرے بندے یہ رسی گلے میں ڈال لے میں کھینچ لوں گا، یہ بڑا خوش ہوا کہ میری دعا قبول ہوگئی، اس نے رسی کا پھندا گلے میں ڈال لیا اور مسخرے نے کھینچنا شروع کیا اب جو گلا گھٹا اور سانس رکا تو وہ کہتا ہے کہ اے اللہ مجھے چھوڑ میں نہیں کھنچتا پھر اس درخت کے پاس بھی نہیں پھٹکا۔ غرض اگر حق تعالیٰ کے حسن کا نعوذ باللہ احاطہ ہوجاتا اور کوئی حجاب باقی نہ رہتا تو جنت وبال جان ہوجاتی مگر چونکہ ان کا حسن غیر محدود ہے اس لیے کبھی جی نہ بھرے گا بس وہ حال ہوگا۔

یزیدیك وجهه حسنا اذا مازدته نظرا(۱)

جتنی دفعہ دیدار ہوگا نیا ہی حسن معلوم ہوگا تو جیسی کنہ ذات جنت میں مکشوف نہ

(۱) ''جتنی دفعہ تُو اس محبوب کو دیکھے گا اس کا حسن تجھ کو زیادہ ہی معلوم ہوگا''

ہوگی آج مسئلہ قدر بھی اور استعداد کا اختلاف مسئلہ قدر کی طرف راجع ہے جب اس کی حقیقت آخرت میں بھی منکشف نہ ہوگی تو دنیا میں کیا امید ہے ہاں بعضوں کو کچھ کچھ اسرار ذوقی طور پر بتلادیئے گئے ہیں مگر وہ ان کو ظاہر نہیں کرسکتے اگر تقدیر کے اسرار ظاہر ہوجائیں تو بدنفس لوگ اپنے کو معذور قرار دے کر شورش برپا کردیں اور تمام عالم درہم برہم ہوجائے۔ اسی مثال کو مولانا فرماتے ہیں:

سر پنہان است اندر زیر وبم فاش اگر گویم جہاں برہم زنم (۱)

شاید اس پر کوئی کہتا ناتمام ہی کہہ دو صاف صاف نہ کہو تو جواب دیتے ہیں:

بالب دمساز خود گر جفتمے ہمچو نے من گفتنیہا گفتمے (۲)

یعنی ناتمام بھی ہر شخص سے نہیں کہہ سکتے بلکہ دمساز سے کہہ سکتے ہیں یعنی اہل سے کہ وہی ہمراز ہے نااہل سے تو ناتمام اسرار بھی بیان نہیں کرسکتے اور بعض دفعہ جو مخاطب کو اہل دیکھ کر بیان کا تقاضا بھی ہوا ہے تب بھی عذر فرمایا ہے۔ چنانچہ ایک مقام پر فرمایا ہے:

لا تکلفنی فانی فی الفنا قلت افهامی فلا احصی ثنا

کل شئی قاله غیر المفیق ان تکلف او تصلف لا یلیق (۳)

اللہ تعالیٰ کے اسرار

غرض یہ خدا تعالیٰ کے اسرار ہیں کہ کسی میں کیسی استعداد رکھ دی کسی میں کیسی اس لیے اس دال کا کسی کو حق نہیں کہ فلاں کو مقصود سہولت سے کیوں دیا اور ہم کو مشقت سے کیوں دیا وہ یہی چاہتے ہیں کہ ایک کو ہنسائیں ایک کو رلائیں کسی کا ہنستے کھیلتے گھر بس جاتا ہے کسی کو برسوں رونے سے بھی جلا حاصل نہیں ہوتا۔

بگوش گل چہ سخن گفتہ کے خندان ست بعند لیب چہ فرمودہ کہ نالان ست (۴)

---

(۱) ''زیر وبم کے اندر اسرار پوشیدہ ہیں اگر فاش کردوں تو جہاں کو درہم برہم کردوں'' (۲) ''ہاں اہل اور مناسبت والا مل جاوے تو خود تقاضا ہوگا کہ اس سے راز دل کو کہا جائے'' (۳) ''میں مقام فنا میں ہوں حق تعالیٰ کے غیر محدود صفات کا میرے افہام احاطہ نہیں کرسکتے۔ ایک بیہوش جو کچھ بھی کہے گا وہ نامناسب رہے گا اگرچہ بات صحیح ہو لیکن تکلف سے بات بے مزہ ہوتی ہے یہ انشراح قلب نہ ہونے سے خاموشی مناسب ہے'' (۴) ''گل کے کان میں کیا کہہ دیا ہے کہ وہ ہنس رہا ہے (شگفتہ ہے) اور بلبل کے کان میں آپ نے کیا راز کہہ دیا کہ وہ ہر وقت نالاں ہے''

اور جب سر قدر (۱) کا احاطہ نہ ہوسکتا تھا اور حصول اس کی کنہ کا ممتنع تھا (۲) تو یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحمت ہے کہ آپ نے ہم کو سوال قدر سے منع (۳) ہی فرمادیا اور ارشاد فرمایا کہ جو شخص اس میں بحث کرے گا قیامت میں اس سے پوچھا جاوے گا اور اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس عمل کا ثواب ہوگا کیونکہ اس میں سب اعمال متساوی ہیں اس کی تخصیص کیا بلکہ محققین کے نزدیک مراد یہ ہے کہ جو شخص تقدیر میں گفتگو کرے گا اس سے قیامت میں یہ پوچھا جائے گا کہ بتلاؤ تقدیر کی حقیقت کیا تحقیق کی اور حقیقت میں معلوم ہوگی نہیں تو یہ شخص جواب سے عاجز ہوکر سزا میں گرفتار ہوگا اور جو اس میں گفتگو نہ کرے گا وہ بے کھٹکے ناجی رہے گا، نیز تقدیر کا مسئلہ گفتگو سے حل بھی نہیں ہوسکتا، اس میں اطمینان وشرح صدر صرف نور باطن سے ہوتا ہے اور جن پر یہ راز خود بخود منکشف ہوگیا ہے کچھ نہ پوچھو ان پر کیا گزرتی ہے اس سے معرفت ومعیت حق کا تو مزہ ہوتا ہے کیونکہ اس سے معرفت بڑھتی ہے اور حق تعالیٰ کی معیت میں ترقی ہوتی ہے مگر ساتھ ہی بدمزگی بھی ایک خاص قسم کی ہوتی ہے کہ دوسرا شخص اس کا تحمل بھی نہیں کرسکتا وہ یہ کہ ہر وقت دل پر ایک حیرت سی غالب رہتی ہے کبھی جبر کی طرف چلتا ہے کبھی اختیار کی طرف (۴) پھر گو محقق نہ جبر پر جمتا ہے نہ اختیار پر بلکہ بین بین (۵) رہتا ہے لیکن دل تو حیرت میں ہوتا ہے کبھی ادھر جاتا ہے کبھی ادھر، مولانا عملاً اس معیت کو تو یوں فرماتے ہیں:

گر بعلم آئیم ما ایوان اوست   در بجہل آئیم مازندان اوست
گر بخواب آئیم مستان روئیم   ور بہ بیداریست بستان اوئیم (۶)

اور کنیات متعارضہ میں معیت کی نسبت فرماتے ہیں:

در تردد ہر کہ او آشفتہ است   حق بگوش او معمہ گفتہ است (۷)

---

(۱) تقدیر کے راز کا (۲) اس کی حقیقت تک رسائی ممکن نہ تھی (۳) تقدیر کے بارے میں سوالات کرنے سے منع فرمایا (۴) کبھی دل کہتا ہے انسان مجبور ہے کبھی کہتا ہے مختار ہے (۵) محقق آدمی اپنے کو نا مجبور محض سمجھتا ہے نا ہی مختار بلکہ کچھ مجبور کچھ مختار سمجھتا ہے کسی نے حضرت علیؓ سے سوال کیا انسان مجبور ہے یا مختار کہا ایک پیر اٹھاؤ اس نے اٹھالیا کہا دوسرا اٹھاؤ اس نے کہا یہ ممکن نہیں فرمایا بس اتنا مجبور اور اتنا مختار (۶) ''اگر صفت علم کی تجلی ہوتی ہے تو ہم اس کے حضوری کے محل میں ہوتے ہیں اور جب وہ تجلی مستور ہوجاتی ہے تو ظلمت جہل کے سبب اگر نیند میں ہوتے ہیں تو غایت تعلق مع اللہ سے ہم انہیں کے مست ہوتے ہیں اور بیداری میں انہیں کے دست قدرت کے تحت رہتا ہوں'' (۷) ''جو شخص تردد سے پریشان ہے کہ یہ کروں یا وہ کروں تو اس کو مولانا فرماتے ہیں کہ یہ حق تعالیٰ نے اس کے کان میں معمہ کہہ دیا ہے کہ اس کو حل کرو''

اور عملاً معیت کو یوں فرماتے ہیں:

رشتہ درگرد نم افگندہ دوست می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست(۱)

اور حیرت کی نسبت یوں فرماتے ہیں:

کہ چنیں بنماید وگہ ضد ایں جز کہ حیرانی نباشد کار دیں(۲)

اہل اللہ کو نعیم دنیا بلا مشقت ملتی ہے

غرض تقدیر کے باب میں نہ گفتگو کرنا چاہیے اور نہ اس کی لم (۳) دریافت کرنا چاہیے کہ ہر شخص میں استعداد مختلف کیوں رکھی ہے یہ حق تعالیٰ کے اسرار ہیں خدا نے استعداد و مقادیر مختلف بنا کر اپنے بعض بندوں کو یہ دولت عطا کی ہے کہ جہاں انہوں نے نماز شروع کی اور خدا تعالیٰ کی طرف فوراً دل کا رخ ہو گیا، حضور میں غرق ہو گئے پھر اس کے ساتھ روٹی بھی بے مشقت دی ہے ان کا مرغ اور گھی اور حلوے بھی بے تکلف دے رکھے ہیں اور یہ باطنی مٹھائی بھی ہے بے تکلف دیدی اور تم کو دنیا کی نعمتیں بھی مشقت سے ملتی ہیں اور دین کی نعمت بھی مشقت سے ملے گی۔ چنانچہ بعضوں کی حالت یہ ہے کہ جب نماز کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو ان کا دل خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا بلکہ اس ادھیڑ بن میں رہتا ہے کہ کل کو کہاں سے کھاؤں گا آج تو گھر میں آٹا بھی نہیں کل کو قرض خواہ تقاضا کرنے آئے گا اسے کہاں سے دوں گا، آج تو جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں یہاں تک کہ انہیں خرافات میں نماز ختم ہو جاتی ہے۔ شیخ سعدی ایسے ہی لوگوں کا حال بیان فرماتے ہیں کہ:

شب چو عقد نماز بربندم چہ خورد با مداد فرزندم(۴)

کہ رات کو جب یہ لوگ نماز کی نیت باندھتے ہیں تو یہ سوچتے ہیں کہ کل کو بچے کیا کھاویں گے۔ ایک اہل زبان نے اس شعر کی عجیب تفسیر کی۔ ''شب چو عقید نماز بربندم چناں در فکر عیال مستغرق باشم کہ بجائے تکبیر تحریمہ میگویم چہ خورد بلداد فرزندم''(۵)

(۱) ''میرے دوست نے میری گردن میں ایک رسی ڈال رکھی ہے اور جدھر اس کا دل چاہتا ہے مجھے لے جاتا ہے'' (۲) ''کبھی اسی طرح دکھاتا ہے کبھی اس کے خلاف دکھاتا ہے بس اس طرح مجھے محبت کے راستے میں محو حیرت رکھتے ہیں'' (۳) وجہ (۴) ''رات کو جب نماز کی نیت باندھتا ہوں تو فوراً یہ خیال ستاتا ہے کہ کل میرے بچے کیا کھائیں گے'' (۵) ''رات کو جب نماز کی نیت باندھتا ہوں تو فکر اہل وعیال میں ڈوب جاتا ہوں تکبیر تحریمہ کے بجائے منہ سے نکلتا ہے میرے بچے کل کیا کھائیں گے۔

واقعی اہل زبان اپنی زبان کو خوب سمجھتے ہیں ہمارا ذہن تو اس طرف نہ جاتا مگر وہ صاحب زبان تھا خوب سمجھا اس پر ایک حکایت یاد آئی۔

اہل زبان کی برابری کا دعویٰ غلط ہے

دہلی سے ایک ہندوستانی ایران گیا اور وہاں برسوں رہ کر فارسی سیکھی، پھر ہندوستان واپس آکر دعویٰ کیا کہ مجھے اہل زبان کے برابر فارسی آتی ہے۔ ایک ایرانی کو سن کر جوش آیا کہ ہندوستانی آدمی اہل فارس کی برابری کا دعویٰ کرتا ہے جھوٹا ہے میں اس کا امتحان کروں گا۔ چنانچہ امتحان کے لیے آیا اور کہا کوئی شعر بالبدیہہ(۱) فارسی کا سناؤ، اس نے اسی وقت ایک شعر لطیف پڑھا:

سیہ چوری بدست آں نگارے نازنیں دیدم بشاخ صندلین پیچیدہ مارے آتشیں دیدم(۲)

بظاہر شعر نہایت نفیس مگر ایرانی نے یہ سنتے ہی کہا تف تف (۳) یہ نازنین دیدم آتشیں دیدم کیا بلا ہے بس اتنا کافی ہے۔

سیہ چوری بدست آن نگارے بشاخ صندلیں پیچدہ مارے(۴)

ارے اس تشبیہ کا مدار تیرے دیکھنے پر تھوڑا ہی موقوف ہے جو تو نے دیدم دیدم دونوں جگہ بڑھایا ہے۔ واقعی اس اصلاح سے یہ شعر کہیں سے کہیں پہنچ گیا اور معلوم ہوگیا کہ غیر اہل زبان چاہے کتنا ہی ماہر ہوجائے اہل زبان کے برابر نہیں ہوسکتا۔ دیوبند میں ایک ایرانی طالب علم گلستاں کے اس جملے پر وجد کرتا تھا۔ درغفوان جوانی چنانہ افتد دانی نظر داشتم برروئے وگذر داشتم در کوئے۔ اور کہتا تھا کہ یہ جملہ نہایت ہی بلیغ ہے۔ اس میں فصاحت وبلاغت کوٹ کوٹ کر بھری ہے مگر ہم لوگوں نے بارہا اس کو پڑھا پڑھایا ہے ایک دن بھی وجد نہ ہوا تو اپنی زبان کو زبان داں ہی سمجھ سکتا ہے جیسا کہ اس ایرانی نے اس شعر کا مطلب سمجھا۔

شب چو عقد نماز بر بندم چہ خورد با مداد فرزندم(۵)

---

(۱) بلاسوچے سمجھے سناؤ (۲) ''سیاہ چوڑی اس معشوق کی کلائی میں ایسی معلوم ہورہی تھی جیسے صندل کی کسی شاخ میں سانپ لپٹا ہوا ہو'' (۳) افسوس کیا کہتے ہو نازنین دیدم آتشیں دیدم کہنے کی کیا ضرورت ہے (۴) ''سیاہ چوڑی اس معشوق کے ہاتھ میں اس طرح معلوم ہوئی ایسے شاخ صندلیں پر سانپ لپٹا ہوا ہو'' (۵) ''شب کو جب نماز کی نیت باندھی تو خیال آیا کہ کل بچے کیا کھائیں گے''

گاؤں والوں کو خلوص مشکل سے حاصل ہوتا ہے

یعنی تکبیر تحریمہ کے بجائے منہ سے یہ نکلتا ہے ''چہ خورد بامداد فرزندم'' (میرے بال بچے کیا کھائیں گے) اور پریشانی کے وقت نماز میں منہ سے ایسی بات کا نکل جانا مستبعد نہیں ہوسکتا کہ یہ لفظ ہی زبان پر جاری ہوجائے جیسے ہمارے ایک دوست حافظ اکبر کا قصہ ہے کہ وہ ایک امام کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے دو مقتدی اور تھے امام کو حدث (۱) ہوا تو اس نے ان کو سمجھ دار واقف مسائل خیال کر کے خلیفہ (۲) بنادیا، یہ مصلے (۳) پر جا پہنچے تو ان دو مقتدیوں میں سے ایک دوسرے سے کہتا ہے کہ ارے یہ کیا ہوا دوسرے نے کہا چپ رہ یوں بھی ہوا کرتا ہے دونوں مقتدیوں کی نماز تو فاسد ہوئی (۴) اب حافظ اکبر صاحب مصلے پر کھڑے کھڑے فرماتے ہیں کہ میں کس کو نماز پڑھاؤں ان کی بھی گئی (۵) یہ سب سے بڑھ کر عقلمند نکلے کہ میں کسے نماز پڑھاؤں، بندہ خدا اپنے ہی کو پڑھائی ہوتی مگر اس وقت بے ساختہ ان کی زبان سے یہ جملہ نکل ہی گیا۔ اسی طرح بے ساختگی میں مفلس پریشان کی زبان سے بجائے اللہ اکبر کے ''چہ خورد بامداد فرزندم'' نکل سکتا ہے۔ الغرض اس میں بھی حکمت الٰہی ہے کہ بعضوں کو خلوص بسہولت حاصل ہوجاتا ہے اور گاؤں والوں کو دقت سے حاصل ہوتا ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ گاؤں والے خصوص کے مکلف ہی (۶) نہ ہوں، مکلف ضرور ہیں اس پر بظاہر ایک اشکال بھی ہوتا ہے وہ یہ کہ اگر گاؤں والوں کو ایسی حالت میں خلوص حاصل نہیں ہوسکتا تو پھر ان کو اس کا مکلف کرنا تکلیف مالا یطاق ہے (۷) اور بہت لوگوں کا یہی خیال ہے کہ ان کو یہ دولت حاصل نہیں ہوسکتی ہے اسی واسطے بعض لوگ ان کو بہائم (۸) سمجھتے ہیں مگر یہ خیال غلط ہے گاؤں والوں کو مکلف بہ تحصیل خلوص ہونا تکلیف مالا یطاق کو ہرگز مستلزم نہیں (۹) کیونکہ خلوص کی تحصیل ان کی قدرت میں داخل ہے خارج از طاقت (۱۰) نہیں اگر وہ ارادہ اور

(۱) امام کا وضوء ٹوٹ گیا (۲) اپنا نائب بنادیا کہ مسئلہ جانتے ہیں نماز مکمل کرادیں گے (۳) امام کی جائے نماز پر چلے گئے (۴) ٹوٹی ہی تھی (۵) امام کی بھی ٹوٹ گئی (۶) پابند (۷) ایسی بات کا پابند کرنا جس کی طاقت نہیں رکھتے (۸) جانور (۹) گاؤں والوں کو خلوص کی پابندی کا حکم دینا کسی ایسی بات کا حکم نہیں ہے جس کی وہ طاقت نہ رکھتے ہوں (۱۰) طاقت سے باہر نہیں

کوشش کریں تو مقصود میں کامیاب ہو سکتے ہیں اور اس کے لیے ان کو اپنی کھیتی کے کام بھی چھوڑنا نہ پڑیں گے بلکہ اپنے کام میں مشغول ہو کر بھی مقصود حاصل کر سکتے ہیں۔ چنانچہ کر کے دیکھ لیں ہوتا ہے یا نہیں اب شبہ یہ ہوتا ہے کہ پھر طریق بیکار ہے کیونکہ جب گاؤں والوں کو بھی مقصود حاصل ہو سکتا ہے گو اپنے کام ہی میں لگے رہیں اور باقاعدہ سلوک طے نہ کرے تو پھر طریق سلوک سے کیا نفع ہوا، جواب یہ ہے کہ نفس حصول خلوص تو طریق پر موقوف نہیں لیکن سہولت حصول خلوص (۱) ضرور طریق پر موقوف ہے جس شخص نے طریق کو حاصل نہیں کیا وہ بھی خلوص میں کامیاب ہو سکتا ہے مگر دقت اور دشواری سے اور جس نے طریق کو طے کر لیا ہے وہ نہایت سہولت سے اس میں کامیاب ہوتا ہے اور ان دونوں کی ایسی مثال ہے جیسے پکا حافظ اور کچا حافظ، تراویح میں قرآن دونوں سنا سکتے ہیں مگر دونوں میں جو فرق ہے ظاہر ہے پکا حافظ تو اللہ اکبر کہتے ہی بے تکلف رواں پڑھتا چلا جائے گا اسے کہیں متشابہ نہ لگے گا اور کچا حافظ بیسیوں جگہ اٹکے گا اور متشابہ کی وجہ سے کہیں سے کہیں پہنچ جائے گا پھر لوٹ کر اوپر سے پڑھے گا اور سوچ سوچ کر متشابہ کو نکالے گا۔ اسی طرح جو لوگ طریق کو حاصل کئے ہوئے ہیں (۲) ان کی تو یہ حالت ہے کہ جہاں انہوں نے نماز کی نیت کی اور فوراً ذکر میں غرق ہو گئے (۳) ان کے خیالات ادھر ادھر پریشان نہیں پھرتے کیوں انہوں نے مجاہدے کئے ہیں ریا و کبر (۴) وغیرہ کا علاج کیا ہے مشقتیں جھیلیں ہیں۔ اب ان کے دل میں غیر خدا کا خیال بھی نہیں آتا اور اگر آیا بھی تو ذرا سی توجہ سے دفع ہو گیا اور جن لوگوں نے طریق طے نہیں کیا اور یہ مشقتیں نہیں جھیلیں نہ مجاہدات و ریاضت کئے ہیں ان کے لیے یہ مشکل ہے کہ نیت باندھتے ہی دل کا رخ حق تعالیٰ کی طرف ہو جائے ان کو چاہیے کہ اپنی طرف سے کوشش کر کے نفس کو پنجرے میں بند کریں اور اپنے ارادہ سے کوئی خیال نہ لاویں اور نفس کو گھیر گھار کر مقید کریں جیسے مرغی کو گھیر گھار کر کھڈے میں بند کیا کرتے ہیں اگر اس نے اس کا اہتمام کر لیا تو دونوں کی نمازیں ایک میزان میں ہوں گی بلکہ جس نے نفس کو مشقت سے گھیر گھار کر مقید کیا ہے اور مصیبت کے ساتھ خیالات کی آمد کو روکا ہے اس کے لیے مشقت کا اجر زیادہ ہوگا۔

(۱) سہولت سے خلوص کا حاصل ہونا (۲) طریق سلوک کو حاصل کر چکے (۳) ڈوب گئے (۴) تکبر۔

حضرت ابراہیم بن ادہم رحمہ اللہ کی حکایت

حضرت ابراہیم بن ادھم رحمۃ اللہ علیہ کو کسی نے خواب میں دیکھا، پوچھا حضرت آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا، فرمایا کہ خدا تعالیٰ نے مجھے بخش دیا اور نہایت چین میں ہوں مگر ہمارا پڑوسی ہم سے بھی بڑھ گیا حالانکہ نہ اس نے وہ مجاہدات کئے جو ہم نے کئے تھے نہ طریق سلوک طے کی، وہ بیچارا اہل وعیال والا تھا، سوائے ضروریات واجبات وفرائض کے کچھ نہ کرتا تھا، دن بھر اہل وعیال کے لیے کسب معاش کرتا تھا لیکن ہر وقت اس میں رہتا تھا کہ کاش میرے لیے بھی کبھی وہ دن آئے کہ ابراہیم بن ادھم رحمہ اللہ کی طرح مطمئن ہو کر اللہ کا نام لوں اور یہ حال ہو۔

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روئے بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہامی وہوی(۱)

اور یہ حال ہو

چہ خوش است با تو بزمے بہفتہ ساز کردن درخانہ بند کردن سر شیشہ باز کردن(۲)

ساری عمر وہ اسی تمنا میں رہا مگر ایک دن بھی اسے فراغ نصیب نہ ہوا لیکن آج جو اس کو درجات ملے ہیں ابراہیم ان کو ترس رہا ہے۔

نیت کا اجر

اور حق تعالیٰ نے اس کی نیت پر نظر فرمائی گو عمل قلیل تھا مگر اس کا ارادہ تو ہر وقت یہی تھا کہ ذرا فراغ نصیب ہو(۳) تو یوں ذکر کروں اس طرح نمازیں پڑھوں اور اس طرح مجاہدات کروں۔ بس اس کی یہ نیت قبول ہوگئی اب کیا حقیر سمجھتے ہو اے صوفیو! تم ان گاؤں والوں کو، ممکن ہے کہ یہ تصوف میں بھی تم سے افضل ہوں کیونکہ تصوف نام خلوص فی الاعمال کا ہے تو ممکن ہے کہ بعضے گاؤں والے خلوص میں تم سے بڑھے ہوئے ہوں پھر جس مشقت سے وہ اپنے اہل وعیال کے لیے کسب معاش کرتے ہیں اور اس کے ساتھ

(۱) ''فراغ قلب سے ایک نظر معشوق کے چہرہ پر ڈالنا اسی شاہی چھتری سے بہتر ہے کہ سلطنت کی پائے ہوئے کا شور وغوغا ہو'' (۲) ''کیا ہی اچھا ہو کہ تیرے ساتھ ایک خفیہ مجلس اور گھر کا دروازہ بند کر کے جام شراب کی مہر کھولی جائے'' (۳) فرصت ملے تو

خلوص میں جوان کو دقت پیش آتی ہے اس کی وجہ سے ان کے درجات آخرت میں تم سے بڑھ جائیں۔ یہ حق تعالیٰ کا راستہ ہے جو ہر شخص کے لیے مختلف ہے کسی کو کھیتی اور ہل جوتنے ہی میں مقصود تک پہنچادیا، کسی کو خانقاہ میں رکھ کر پہنچادیا، کسی کو سہولت سے پہنچایا، کسی کو مشقت سے کسی کو بسط کی راہ سے لے گئے کسی کو قبض کی راہ سے۔ ایک ایسے عاشق ہیں کہ ڈھول پیٹتے ناچتے کودتے مقصود تک پہنچتے ہیں جیسے چشتیہ ہیں کہ یہ اپنے کو بھی بدنام کرتے ہیں اور محبوب کا بھی پردہ کھول دیتے ہیں۔

عشق معشوقاں نہان است وستیر عشق عاشق بادو صد طبل ونفیر(۱)

ایک نقشبندیہ ہیں جو چپ چاپ راستہ طے کرتے ہیں نہ اپنے عشق کو ظاہر کریں نہ محبوب کا راز فاش کریں۔ مولانا جامی فرماتے ہیں:

نقشبندیہ عجب قافلہ سالارانند کہ بنداز رہ پنہاں بحرم قافلہ را(۲)

ایک کو مسہل دے دیا ہے(۳) وہ بھڑ بھڑ کر رہا ہے ایک کو نخاخہ(۴) سونگھا دیا وہ خراٹے لے رہا ہے ایک کو ایسی نفیس دوا دی کہ آواز بھی نہیں نکلتی کسی کو کسی پر اعتراض کا حق نہیں، طبیب نے جس کے مناسب جو دوا دیکھی وہی اس کو دیدی اس میں مریض پر کیا اعتراض ہے۔ ایک شخص کو تو پھول دیدیئے وہ تو اس کی خوشبو میں مست ہے اور ایک سے پھول خرچ کرا کر اس کے دل میں ایک باغ لگا دیا۔

خود کہ باید ایں چنیں بازار را کہ بیک گل میخری گلزار را(۴)
نیم جاں بستاند وصد جاں دہد آنچہ در وہمت نیاید آں دہد(۵)

یہ روتا ہے کہ ہائے مجھ سے پھول چھین لیے، وہ تسلی دیتے ہیں کہ بے وقوف

(۱) ''معشوقوں کا عشق پوشیدہ اور پنہاں ہوتا ہے اور عاشقوں کا عشق ہو اور سینکڑوں ڈھول اور نفیر کی طرح شور وغوغا کرتا ہے'' (۲) ''نقشبندی سلسلے کے لوگ عجیب سالار قافلہ ہیں کہ مخفی راہ سے مراقبہ کئے ہوئے کعبہ شریف (حرم) تک قافلہ طالبان کو پہنچادیتے ہیں، یعنی سلوک طے کرادیتے ہیں'' (۳) دست لانے والی دوا دی جس کی وجہ سے اس کو دست آرہے ہیں (۴) چند خوشبودار چیزوں کا مجموعہ جو تقویت دماغ کے لیے مریض کو سنگھایا جاتا ہے (۵) ''ایسے کریم کا بازار لطف وکرم کون پاسکتا ہے کہ ایک گل کے عوض میں گلزار خرید سکتے ہو'' (۶) ''یہ وہی جان لیتے ہیں مجاہدات میں اور اس کے انعام میں سینکڑوں جانیں عطا فرماتے ہیں بلکہ ایسی نعمتیں بھی عطا فرماتے ہیں جو تیرے وہم وگمان میں بھی نہیں ہیں''

تجھے ہم باغ دیں گے جس میں ہزاروں پھول دار درخت ہوں گے، یہ پھول تو چند روز میں کملا جائیں گے اور درخت لگنے کے بعد ہمیشہ تازہ بہ تازہ نو بہ نو پھول لگیں گے۔ یہی حال اس شخص کا ہے جس سے کیفیات چھین لی جاتی ہیں وہ روتا ہے کہ ہائے کیفیات جاتی رہیں اور یہ نہیں جانتا کہ اس کے بعد مقامات عطا ہوں گے جو بمنزلہ باغ کے ہیں حصول مقامات کے بعد سب کیفیات تمہارے قبضہ میں ہوجائیں گی کہ جس وقت جس کیفیت کو چاہو اپنے اوپر وارد کرلو اب تو گھر میں درخت موجود ہیں اب کیا غم ہے غرض یہ حق تعالیٰ کا راستہ ہے جو صوفیوں ہی کے لیے مخصوص نہیں۔ گاؤں والے بھی اس کو طے کر سکتے ہیں گو مشقت (۱) ہی سے طے کریں سو مشقت والوں کو حقیر مت سمجھو ان پر ہنسو نہیں کہ یہ کس مصیبت سے چل رہا ہے اور ہم کیسے ہلکے پھلکے چل رہے ہیں تم کو کیا خبر ہے کہ عنداللہ کون بڑھا ہوا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جب قیامت میں اہل مصیبت کو نعمتیں دی جائیں گی تو اہل نعمت کہیں گے کاش دنیا میں ہماری کھال قینچی سے کتری گئی ہوتی اور آج ہم کو بھی یہ درجے ملتے تو تم کو کیا قدر ہے ان مصیبت والوں کی، لکھنؤ والوں کو مرچوں کی کیا قدر وہ ہم پر ہنستے ہیں کہ یہ کھانا کیا کھاتے ہیں، آگ کھاتے ہیں اور ہم ان پر ہنستے ہیں کہ تم کھانا کھاتے ہو خاک (۲) کھاتے ہو واقعی جس کھانے میں مرچیں نہ ہوں وہ تو مٹی ہے۔ بعض لوگ کریلے کی تلخی (۳) دور کر کے پکاتے ہیں میں کہا کرتا ہوں کہ وہ کریلا ہی کیا جو کڑوا نہ ہو۔

ملاجیون کی حکایت

ملاجیون کا قصہ ہے کہ شاہ عالمگیر نے ان کی دعوت کی اور عرض کیا کہ آپ کچھ فرمائش کیجئے انہوں نے گلگلوں کی فرمائش کی۔ باورچی نے نہایت اعلیٰ درجہ کے گلگلے تیار کئے مگر ان کو پسند نہ آئے۔ بادشاہ کو محسوس ہوا حکم دیا اور اچھے پکائے جاویں، پہلے سے بھی اعلیٰ درجہ کے پکائے وہ بھی پسند نہ آئے، باورچی سمجھ گیا، تیسرے دن اس نے گڑ اور تیل کے پکائے، بہت خوش ہوئے کہ ہاں آج پکے ہیں۔

(۱) مشکل (۲) مٹی (۳) کڑواہٹ

امور دین میں ہمت سے کام لینے کی ضرورت

تو اے صاحبو! جب دنیا کی بعض چیزیں ایسی ہیں جو تلخی کے ساتھ ہی لذیذ ہیں پھر دین کے کاموں میں کیوں تعجب ہوتا ہے اگر وہ باوجود تلخی کے کسی کو لذیذ معلوم ہوتے ہوں پھر دین کے واسطے ذرا سی تلخی کیوں گوارا نہیں ہوتی مجھے اس کی دو زندہ مثالیں یاد ہیں۔ ایک مرچ ایک تمباکو کہ ان کی لذت سوزش اور تلخی ہی کے ساتھ ہے، تمباکو جتنا تیز اور کڑوا ہو اتنا ہی تمباکو کھانے والوں کے نزدیک عزیز ہے(۱) پھر حیرت ہے کہ دین کے لیے ذرا سی سوزش اور تلخی گوارا نہ ہو۔ اسی طرح مرچ جتنی تیز اور تلخ ہو، میں سچ کہتا ہوں کہ اگر آج تم کو دین کا کوئی کام گراں (۲) اور ناگوار معلوم ہوتا ہے تو تم اس پر عمل کر کے دیکھو، چند دن میں اس کی تلخی لذیذ معلوم ہوگی۔ پس گاؤں والوں کو ہمت نہ ہارنا چاہیے اور گو ان کو دین کے کاموں میں مشقت معلوم ہو مگر ہمت کر کے عمل کرنا چاہیے پھر جس طرح ان کو ہل جوتنا(۳) آسان ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ دین کے کام آسان ہو جائیں گے۔ چند روزے جہد کن باقی بخند (چند روز کوشش کرو بقیہ میں آرام سے ہنسنا) اسی طرح جس شخص کو پہلے کیفیات حاصل تھیں جن سے کام آسانی سے ہو رہا تھا اور اب کیفیات حاصل نہیں جس کی وجہ سے کام میں جی نہیں لگتا وہ بھی پریشان نہ ہو ہمت کر کے تلخی برداشت کر کے کام میں لگا رہے۔ اس طریق میں قبض و بسط(۴) کا پیش آنا ناگزیر ہے بلکہ قبض اگر نہ ہو تو عشاق کو لذت نہیں آتی۔ مزہ اس میں ہے کہ آج بسط ہے کل قبض ہے۔ عارف شیرازی فرماتے ہیں:

از دست ہجر یار شکایت نمی کنم گر نیست غیبتے نہ دہد لذتے حضور(۵)

عاشق اگر واقعی عاشق ہے تو اس کو یہ خواہش ہوگی کہ محبوب کبھی عتاب بھی کرے، منہ بھی چڑھا دے ہاں فاسق یہ چاہا کرتا ہے کہ معشوق ہر وقت اس کا مطیع ہی رہے، عاشق ہمیشہ خود مطیع ہونا چاہتا ہے، معشوق کو مطیع کرنا نہیں چاہتا۔ حاجی صاحب کا ارشاد ہے کہ آدم علیہ السلام نے جنت میں صرف لطف کی شان دیکھی تھی اس وقت تک

(۱) پسندیدہ (۲) بھاری لگے اور پسند نہ آئے (۳) ہل چلانا (۴) کبھی انقباض کی کیفیت ہوتی ہے کبھی فرحت وخوشی کی حالت ہوئی ہے (۵) ''محبوب کی طرف سے جدائی کا غم آنے پر شکایت نہیں کرتا ہوں کیونکہ اگر غیبت نہ ہو حضوری کی لذت بھی نہ آئے یعنی لذت وصال کی قدر تکلیف فراق کے بعد ہی ہوتی ہے''

تفصیلی معرفت کامل نہ تھی جب ان سے لغزش کا صدور ہوا تو اس میں ان کو شان جلال دکھلائی گئی اس سے ان کی تفصیلی معرفت کامل ہوگئی، تجلی جلال وتجلی جمال دونوں سے واقف ہوگئے، واقعی یہ عجیب راستہ ہے جس میں عقل کام نہیں دیتی بس یہاں تو حیرت ہی حیرت ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

کہ چنیں بنماید وگہ ضد ایں جز کہ حیرانی نباشد کار دیں(۱)

مگر یہ حیرت جہل کی نہیں بلکہ کمال معرفت کی وجہ سے حیرانی ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

نے چنیں حیراں کہ پستش سوی دوست بل چنیں حیراں کہ رویش روی دوست(۲)

یعنی ایک حیرت تو اس شخص کی ہے جس کو محبوب کا پتہ نہیں ملا، غلط راستہ پر چل رہا ہے یہ تو حیرت مذمومہ(۳) ہے اور ایک حیرت اس شخص کی ہے جو محبوب کا جمال دیکھ کر حیران ہو رہا ہے، محبوب کی طرف رخ کئے ہوئے ہے اور اپنے سے بے خبر اس کی حیرت حیرت محمودہ ہے تو عارف کو قبض میں بھی ترقی ہوتی ہے۔ آدم علیہ السلام کے لیے یہ حالت حالت قبض ہی تھی جس میں ان کو پہلے سے زیادہ ترقی ہوئی۔

سیر زاہد در مہے یک روزہ راہ سیر عارف ہر دمے تاخت شاہ(۴)

عارف کی کوئی حالت ترقی سے خالی نہیں ہوتی اس کی سیر ہر دم عرش تک ہوتی ہے پس جس طرح بسط میں ایک حیات ہے قبض میں بھی ایک حیات ہے اس لیے محقق کبھی کیفیات کی قلت سے پریشان نہیں ہوتا وہ ہر حال میں اپنا کام کئے جاتا ہے باقی غیر محقق چونکہ کیفیات ہی کو مقصود سمجھتا ہے وہ دو مفسدوں میں مبتلا ہوجاتا ہے بعضے تو کیفیت کے نہ ہونے سے عمل میں کمی کردیتے ہیں اور بعضے کیفیت کے ہونے سے عمل میں کمی کردیتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر مفصلاً بیان کیا گیا ہے یہ دونوں حالتیں اچھی نہیں اس لیے اس خیال کو دل سے نکال دینا چاہیے اور کیفیات کو مقصود نہ سمجھنا چاہیے۔ یہ تتمہ تھا پہلے بیان کا اور اتنی لمبی تقریر کا قصد نہ تھا ارادہ مختصر تقریر کا تھا مگر بلا قصد کے اتنی لمبی ہوگئی۔ خیر

(۱) ''کبھی اس طرح دکھاتے ہیں کبھی اس کے ضد کو دکھاتے ہیں، دین کے کام میں حیرانی ہی حیرانی ہے'' (۲) ''لیکن یہ حیرانی ایسی نہیں ہے کہ دوست کی پیٹھ دوست کی طرف ہو بلکہ ایسی حیرانی ہے محبوب کا چہرہ عاشق کے چہرہ کی طرف ہے'' (۳) ناپسندیدہ (۴) ''زاہد کی سیر ایک ماہ میں ایک دن کا راستہ ہے اور عارف ہر سانس میں شاہ حقیقی کے تخت تک پہنچتا ہے''

حرج ہی کیا ہے ہر چیز کا لمبا ہونا برا نہیں، قد کا لمبا ہونا تو برا ہے مگر زلف کا دراز ہونا محبوب ہے ایک مرتبہ ناسخ اور ایک شاعر کسی مجلس رقص میں جمع ہو گئے، رقاصہ لمبی بے ڈول تھی تو ان میں سے ایک نے کہا، طول شب فرقت سے بھی دو ہاتھ بڑی ہے۔

رقاصہ نے ہنس کر بغرض جواب دینے کے کہا کیا، دوسرے نے فوراً کہا وہ زلف مسلسل جو تیرے رخ پہ پڑی ہے۔ اس مصرع نے اس طول کو حسین بنا دیا جو پہلے مصرع سے مذموم معلوم ہوا تھا کیونکہ اس نے اس طول کو زلف کی طرف راجع کر دیا اور زلف کا دراز ہونا عیب نہیں بلکہ مدح ہے۔ ایک تتمہ تو مضمون سابق کا یہ تھا اور دوسرا تتمہ یہ ہے کہ میں نے بیان گزشتہ سے پہلے بیان کیا تھا کہ تقلیل طعام (۱) کو تو شریعت نے مجاہدہ قرار دیا ہے مگر ترک وقاع یا تقلیل وقاع (۲) کو مجاہدہ قرار نہیں دیا اس وقت میں اس مضمون کی کسی قدر تفصیل کرنا چاہتا ہوں۔

زہد کے لیے ترک لذات کافی نہیں

اور شاید میں نے پہلے یہ بھی کہا تھا یا نہیں کہ زہد کے لیے تقلیل لذات (۳) کافی ہے، ترک لذات زہد میں ضروری نہیں کیونکہ سب سے بڑھ کر الذ الاشیاء وقاع ہے (۴) اگر ترک لذات لازم ہوتا تو کم از کم حضور صلی اللہ علیہ وسلم تو اس سے رکتے جیسا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے نکاح نہیں کیا جس کی وجہ سے آج عیسائی فخر کرتے ہیں کہ ہمارے نبی تارک لذات (۵) تھے اور مسلمانوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ تمہارے نبی تارک لذات نہ تھے متبع شہوت تھے (۶) کہ نو نکاح کئے جس سے ناواقف مسلمان ان کے سامنے جھینپتے ہیں سو اگر ترک لذات لازم زہد ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نکاح کو ضرور ترک کرتے تا کہ مخالفین کو مسلمانوں پر اعتراض کا موقع نہ ہوتا جس اعتراض کا یہ نتیجہ ہوا کہ

حضرت عیسیٰ و حضرت یحییٰ علیہما السلام کی قوت مردانگی

ایک بے ادب گنوار نے ایک بے ادب عیسائی کے جواب میں بک دیا کہ پہلے

(۱) کم کھانے کو (۲) ترک جماع یا تقلیل جماع کو (۳) لذات میں کمی کرنا (۴) سب سے لذیذ جماع ہے (۵) لذتوں کو ترک کرنے والے (۶) شہوتوں کا اتباع کرنے والے

تم یہ تو ثابت کردو کہ عیسیٰؑ میں قوت مردانگی بھی تھی اسی وقت ان کے ترک نکاح پر فخر کرنا۔ مگر یہ بھی سخت بے ادبی ہے عیسیٰؑ پر اس ضعف کا شبہ ہرگز نہیں ہوسکتا کیونکہ حدیث بخاری میں ہر قل کا قول مذکور ہے جس پر اجلہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے سکوت کیا جس سے اس کی تقریر ہوگئی۔ ''کذالك الرسل تبعث فی احساب قومها'' کہ انبیاء علیہم السلام ہمیشہ اعلیٰ حسب میں مبعوث ہوتے ہیں کمالات ذاتیہ کو۔ جس سے معلوم ہوا کہ انبیاء علیہم السلام تمام کمالات سے اعلیٰ وجہ الکمال موصوف ہوتے ہیں تا کہ کسی کو ان کے اتباع سے عار نہ ہو اور ظاہر ہے کہ اگر آپ کسی شخص کی نسبت یہ سن لیں کہ وہ عنین (۱) ہے تو طبیعت کو اس سے معاً رکاوٹ ہوجاتی ہے اور وہ شخص فوراً نگاہوں سے گر جاتا ہے حالانکہ اس وقت زیادہ معتقد ہونا چاہیے تھا کیونکہ معلوم ہوا کہ فرشتہ ہے مگر کچھ قاعدہ ہے کہ انسان کے ساتھ اعتقاد جب ہی ہوتا ہے جبکہ اس میں مواد تو سب موجود ہوں پھر اس کے روکنے میں فرشتہ ہو اور اگر خالص فرشتہ ہو تو اعتقاد کم ہوتا ہے۔ اسی واسطے یحییٰ علیہ السلام کے بارے میں جو حصورا وارد ہے اس کے معنی مفسرین نے صبورا لکھے ہیں اور عنین کے ساتھ تفسیر کو منکر کہا ہے (کذا فی الشفاء معللا بان هذه نقيصة وعيب ولا تليق بالانبياء عليهم السلام) بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے نفس کو روکنے والے ہیں چنانچہ سیر سے معلوم ہوتا ہے کہ یحییٰ علیہ السلام نے اخیر عمر میں نکاح کیا تھا (کذا فی الشفاء) جس سے ان کے عنین ہونے کا شبہ بالکل زائل ہوگیا۔ بلکہ معلوم ہوا کہ ایسے قوی مرد تھے کہ ان کی قوت مردانگی بڑھاپے میں باقی رہی اور سیدنا عیسیٰ علیہ السلام اخیر زمانہ میں نازل ہوکر نکاح کریں گے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ویولدله کہ ان کے اولاد بھی ہوگی جس سے ان کے ضعیف ہونے کا شبہ ہو ہی نہیں سکتا بلکہ معلوم ہوا کہ ان کی قوت اتنی زیادہ تھی کہ ہزاروں برس فرشتوں میں رہ کر بھی طاقت کم نہ ہوئی بلکہ اس سے تو بظاہر نظر ان کی یہ قوت حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔

تمام کمالات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم جملہ انبیاء علیہم السلام سے افضل ہیں

مگر نصوص سے ثابت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام کمالات میں انبیاء علیہم السلام سے اکمل ہیں اس لیے یہ شبہ نہیں ہوسکتا الغرض ترک لذات لازم زہد نہیں ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نکاح

(۱) نامرد

نہ کرتے بلکہ تقلیل لذات (۱) زہد کے لیے کافی ہے سو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنے نکاح کئے ہیں آپ کی اصلی قوت کے اعتبار سے وہ تقلیل لذات ہی میں داخل ہیں کیونکہ احادیث میں وارد ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم آپ کے اندر تیس مردوں اور بعض روایات میں ہے کہ چالیس مردوں کی قوت کا اندازہ کرتے تھے اور ایک مرد کی قوت چار عورتوں کے لیے کافی ہے۔ اسی لیے شریعت نے چار نکاح تک کی اجازت دی ہے۔ اس اعتبار سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں اتنی قوت تھی جو ایک سو بیس عورتوں کو اور دوسری روایت کے موافق ایک سو ساٹھ عورتوں کے لیے کافی تھی بلکہ شرح شفاء میں ابونعیم سے مجاہد کا قول نقل کیا ہے کہ یہ چالیس مرد جنت کے مردوں میں سے ہیں اور ان میں ہر مرد کی قوت حسب روایت ترمذی ستر مردوں کے برابر ہوگی اور ایک روایت میں سو مردوں کی برابر آیا ہے تو ایک حساب سے آپ میں تو قریب تین ہزار مرد کے برابر اور ایک حساب سے چار ہزار مرد کے برابر قوت ہوئی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا کمال زہد

پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نو پر صبر کرنا یہ کمال زہد تھا اور آپ اس پر بھی قادر تھے کہ بالکل صبر کر لیتے چنانچہ جوانی میں آپ نے پورا صبر کیا کہ پچیس سال کی عمر میں چالیس سال کی بیوہ عورت سے نکاح کیا، بھلا کنوارا مرد ایسی عورت سے نکاح کر سکتا ہے جو اس کی ماں بن سکے، ہرگز نہیں۔ پس جوانی میں آپ کا چالیس سالہ عورت سے نکاح کرنا اور ساری جوانی اسی کے ساتھ تیر کر دینا اس کی کافی دلیل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم متبع شہوات ہرگز نہ تھے بلکہ آپ اعلیٰ درجہ کے زاہد تھے مگر بوڑھاپے میں آپ نے نو نکاح کئے تو ضرور آپ کے ان نکاحوں میں کوئی حکمت تھی۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نکاحوں میں حکمت

چنانچہ ایک حکمت تو وہ تھی جو بعض عارفین نے بیان کی ہے کہ منشاء تکوین عالم محبت ہے جیسا کہ ''کنت کنزا مخفیا فاحببت ان اعرف فخلقت الخلق'' (۲) سے معلوم ہوتا ہے کہ گو یہ حدیث ان الفاظ سے محدثین کے نزدیک ثابت نہیں مگر

(۱) لذتوں میں کمی ہی (۲) ''میں مخفی خزانہ تھا میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں پس (اس لیے) میں نے مخلوق کو پیدا کیا'' الدر المنتثرہ: ۱۲۶، الاسرار المرفوعۃ: ۲۷۳

مضمون صحیح ہے جو حدیث ''ان اللّٰہ جمیل یحب الجمال''(۱) سے ثابت ہے جس کی تقریر نکت دقیقہ کے مضمون ہشد ہم میں اور کلید مثنوی دفتر اولیٰ قبول کردن خلیفہ ہدیہ را کے تحت شعر گنج مخفی بدز پیری جوش کرد میں احقر نے کی ہے ایک مقدمہ تو یہ ہوا۔ دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ اس محبت تکوین کا مظہر سب سے زیادہ وقاع ہے(۲) کہ اس میں بھی محض محبت بواسطہ وقاع کے سبب ہوجاتا ہے تکون ولد کا بدون کسی تدبیر خاص کے(۳) جیسے تکوین عالم میں محض محبت بواسطہ کلمہ کن(۴) کے سبب ہوگیا تکون عالم بدون کسی خاص تدبیر کے، پس عارف کو عورت کے تلبس میں یعنی جماع میں محبت تکوین کی تجلی کا(۵) مشاہدہ ہوتا ہے اس لیے وہ نکاح کرتا ہے اور اسی لیے جماع کی اس کو دوسروں سے زیادہ رغبت ہوتی ہے اور حدیث ''حبب الی من دنیا کم النساء''(۶) کا مبنی اسی راز کو بعض عارفین نے فرمایا ہے۔ دوسری حکمت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نکاحوں میں یہ تھی کہ امت کو عورتوں کے ساتھ برتاؤ کرنے کا طریقہ معلوم ہو اگر آپ نکاح نہ کرتے اور پھر عورتوں کے حقوق کی تعلیم دیتے تو اس کا زیادہ اثر نہ ہوتا۔ کسی کو شبہ ہوسکتا تھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود تو نکاح کیا نہیں اس لیے بلا تامل عورتوں کے اتنے حقوق بیان فرمادیئے، نکاح کرتے تو شاید ان حقوق کا ادا کرنا مشکل ہوتا اور اب کسی کو یہ کہنے کا منہ نہیں کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امت سے زیادہ نکاح کرکے دکھادیئے اور سب کے حقوق اس خوبی سے ادا فرمائے کہ اس کی نظیر کوئی پیش نہیں کرسکتا۔ حقیقت میں بیبیوں کے حقوق ادا کرنا بڑے عقلمند کا کام ہے۔

بیبیوں کے دو قسم کے تعلقات

کیونکہ بی بی سے دو قسم کے تعلق ہیں ایک علاقہ حاکمیت ومحکومیت کا کہ مرد حاکم ہوتا ہے اور عورت محکوم، دوسرا علاقہ محبت ومحبوبیت کا کہ مرد محب اور عورت محبوب ہوتی ہے۔ علاقہ حکومت کے ساتھ علاقہ محبت کی رعایت کرنا بڑا دشوار ہے۔ اکثر ایسا ہی ہوتا

(۱) ''بے شک اللہ تعالیٰ جمیل ہیں جمال کو پسند کرتے ہیں'' الصحیح لمسلم، کتاب الایمان، ۱۴۷، مسند احمد، ۴: ۱۳۳
(۲) جماع (۳) بچہ کی پیدائش کے لیے صرف جماع ہی سبب بن جاتا ہے کوئی اور تدبیر نہیں کرنی پڑتی (۴) محبت ہی کی بناء پر سارا عالم کلمہ کن سے وجود پذیر ہوگیا (۵) اللہ کی محبت تکوین کا مشاہدہ ہوتا ہے یعنی اللہ جب کسی بات کا ارادہ کرتے ہیں تو صرف کن کہتے ہی اس کو وجود حاصل ہوتا ہے جس طرح صرف جماع کرتے ہی استقرار حمل ہوجاتا ہے تو اس صفت تکوین کا مشاہدہ عارف کو جماع میں ہوتا ہے (۶) مستدرک حاکم: ۲/ ۱۶۰، کنز العمال: ۱۸۹۱۳

ہے کہ اگر محبت کے حقوق ادا کرتے ہیں تو حکومت کے حقوق فوت ہوجاتے ہیں چنانچہ جو لوگ بیبیوں کے عاشق مشہور ہیں وہ اکثر ان کی غلامی ہی کرنے لگتے ہیں ان کی خاک حکومت نہیں ہوتی، بیوی پر نہ کچھ رعب ہوتا ہے اور جو لوگ حکومت کے حقوق ادا کرتے ہیں ان سے محبت کے حقوق فوت ہوجاتے ہیں، دونوں کو جمع کرنا اور ہر ایک کے پورے پورے حقوق ادا کرنا، بی بی پر رعب بھی ہو حکومت بھی ہو اور اس کے ساتھ اس کا دل بھی شوہر سے کھلا ہوا ہو کہ بے تکلف ہنس بھی لے، بول بھی لے اور مذاق بھی کرلے اور اس پر ناز بھی کرلے، یہ انسان کامل کا کام ہے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کرسکتے تھے یا وہ شخص کرسکتا ہے جو آپ کا کامل متبع ہو۔

ناز برداری کے ساتھ رعب کا جمع کرنا سرسری بات نہیں

چنانچہ احادیث میں وارد ہے کہ ایک بار حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو یاد فرمایا تو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے عرض کیا کہ آپ ان بڑھیا کو کیا یاد فرمایا کرتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے ان سے اچھی آپ کو دیدی۔ حدیث میں ہے: ”فغضب حتی قلت والذی بعثك بالحق لا اذکرھا بعد ھذا لا بخیر“ یعنی آپ کو غصہ آگیا جس سے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ڈر گئیں اور بقسم عرض کیا کہ اب سے جب کبھی ان کا ذکر کروں گی بھلائی سے کروں گی۔ یہ حالت رعب کی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا پر تھی جن کو سب سے زیادہ ناز تھا تو دوسرے ازواج (۱) کی تو کیا حالت ہوگی تو ناز برداری کے ساتھ رعب کا جمع کرنا سرسری بات نہیں۔ تیسرے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے چند نکاح کرکے یہ بھی بتلادیا کہ جس کے چند بیبیاں ہوں اسے سب کے ساتھ کس طرح عدل کرنا چاہیے۔ خصوصاً اگر ایک کے ساتھ محبت زیادہ ہو اور دوسروں سے کم ہو تو اس وقت اپنی طرف سے کوئی بات ایسی نہ کرے جس سے ایک کی ترجیح ظاہر ہو بلکہ امور اختیاریہ میں برابری کا پورا خیال رکھے۔ چنانچہ آپ نے یہ بھی کرکے دکھادیا کہ باوجودیکہ آپ کو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے سب سے زیادہ محبت تھی مگر عدل

(۱) بیویوں

میں کبھی آپ نے فرق نہیں کیا، ان میں اور دوسری بیبیوں میں بلکہ ہمیشہ سب میں عدل کی پوری رعایت فرماتے تھے، باقی دل کا ایک طرف زیادہ مائل ہونا یہ آپ کے اختیار سے باہر تھا۔ اس میں برابری کیسے کرتے اس لیے آپ فرمایا کرتے تھے'' اللھم ھذا قسمی فی ما املك فلا تلمنی فیما تملك ولا املك '' (۱) اس میں میلان قلب ہی کی طرف اشارہ ہے جو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف زیادہ تھا۔ اور یہ بات آپ کی طرف سے نہ تھی بلکہ غیب سے ایسے سامان کئے گئے کہ خواہ مخواہ آپ کے دل کو حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی طرف زیادہ میلان ہو چنانچہ نکاح سے پہلے حق تعالیٰ نے خود ایک حریر کے کپڑے میں فرشتہ کے ذریعے سے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی تصویر بھیجی تھی کہ یہ آپ کی بی بی ہیں، جب آپ نے اس کو کھولا تو حضرت عائشہؓ کی تصویر پر نظر پڑی اور وہاں یعنی عالم آخرت میں تصویر جائز ہے۔ اگر تم وہاں اپنا فوٹو کھنچواؤ گے تو ہم منع نہ کریں گے یہ معاملہ حق تعالیٰ نے کسی اور بی بی کے ساتھ نہیں کیا۔ دوسری وحی میں یہ معاملہ تھا کہ کسی بیوی کے لحاف میں آپ پر وحی نہ آتی تھی بجز حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے کہ ان کے لحاف میں بھی آپ ہوتے تو بے تکلف وحی آتی تھی تو یہ باتیں تھیں جن کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حق تعالیٰ ہی نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی جانب زیادہ مائل فرمادیا، پھر اس پر ان کی قدرتی ذہانت وفقاہت اور حسن سیرت سونے پر سہاگہ تھا۔ اصل وجوہ آپ کی محبت کے وہی تھے جو پہلے مذکور ہوئے۔

سب ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ظاہری برتاؤ

حق تعالیٰ کو بھی حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے ساتھ سب بیبیوں سے زیادہ محبت تھی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پھر کیوں محبت نہ ہوتی مگر باہمہ (۲) سوائے محبت قلبی کے ظاہری برتاؤ آپ کا سب کے ساتھ برابر تھا۔ اور اس واقعہ سے یہ شبہ نہ ہو جو صحاح میں وارد ہے کہ ایک مرتبہ ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے مجتمع ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس حضرت ام سلمہ کو اور ان کے بعد حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو بھیجا تھا'' فقالت ان

(۱) ''اے اللہ یہ میری برابری ہے اس چیز میں جس پر مجھے قدرت ہے پس مجھ سے اس بات میں مواخذہ نہ کیا جائے جس چیز پر مجھے قدرت نہیں'' سنن النسائی: ۷ / ۶۴، سنن الترمذی: ۱۱۴۰ (۲) اس سب کے باوجود

ازواجك ينشدلك العدل فی بنت ابی قحافة'' کہ آپ کی ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے متعلق آپ سے عدل کی درخواست کرتی ہیں۔ بات یہ ہے کہ اس واقعہ میں ازواج مطہرات کی درخواست یہ تھی کہ حضور ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمادیں کہ وہ اپنے ہدایہ میں عائشہؓ کی باری کا انتظار نہ کیا کریں بلکہ حضور ﷺ جس بیوی کے یہاں بھی ہوں وہیں ہدایہ بھیجا کریں، اس کی کیا وجہ ہے کہ جب حضور ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے یہاں ہوتے ہیں اسی وقت ہدایا بھیجے جاتے ہیں اور دوسری بیبیوں کی باری میں نہیں بھیجتے۔ حضور ﷺ انکار فرماتے تھے کہ میں صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے ایسا نہ کہوں گا۔ بس آپ کے اس انکار کو ازواج مطہرات رضی اللہ عنہم نے عائشہ رضی اللہ عنہا کی طرفداری پر محمول فرمالیا حالانکہ یہ ان کی اجتہادی غلطی تھی۔ حضور ﷺ کو صحابہؓ سے ایسی بات کہنے سے غیرت مانع تھی کیونکہ ہدیہ تو دینے والے کی خوشی پر ہے اب آپ ان سے یہ فرمائیں کہ تم مجھے ایک دن نہ دیا کرو بلکہ ہر دن دیا کرو۔ اس میں اول تو ایک قسم کا سوال ہے جو حضور ﷺ کی غیور طبیعت کے بالکل خلاف تھا۔ دوسرے ہدیہ دینے والوں کی خوشی کو فوت کرنا ہے جو روح ہے ہدیہ کی ان وجوہ سے آپ انکار فرماتے تھے کہ میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے ہدیہ کے متعلق کچھ نہ کہوں گا۔ بتلایئے اس میں حضرت عائشہؓ کی کیا طرف داری ہے بلکہ حضور ﷺ کی قدرتی طور پر اس بات سے غیرت تھی کہ کس لیے کہنے سے رکتے تھے مگر ازواج نے اس کو بلاوجہ طرف داری پر محمول فرمالیا پھر بعد میں وہ بھی سمجھ گئیں کہ آپ کے انکار کا منشا طبعی غیرت ہے کسی کی طرف داری نہیں خوب سمجھ لو ۱۲ جامع۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حضرت عائشہؓ سے نکاح میں حکمت

پھر آپ ﷺ نے جس وقت حضرت عائشہؓ سے نکاح کیا ہے اس وقت حضور ﷺ کی عمر پچاس سال سے زیادہ تھی اور حضرت عائشہؓ کی نو سال کی تھی وہ بالکل بچی تھیں اور بجز ان کے کوئی بی بی آپ ﷺ کی کنواری نہ تھی۔ اس میں حکمت یہ تھی کہ آپ ﷺ کو امت کو یہ دکھلانا تھا کہ جس شخص کی عمر زیادہ ہو اس کو کنواری بچی کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہیے، عموماً عادت یہ ہے کہ ایسی صورت میں مرد کا برتاؤ اپنی عمر کے تقاضے کے موافق ہوا کرتا ہے مگر حضور ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا

کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جوان کی بچپن کی عمر کا تقاضا تھا، ان کے بچپن کی آپ پوری رعایت فرماتے تھے، چنانچہ ایک مرتبہ مسجد کے قرب میں حبشی لڑکے عید کے دن کھیل کود رہے تھے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے پوچھا کہ حبشیوں کا کھیل کود دیکھوگی؟ انہوں نے خواہش ظاہر کی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پردہ کرکے دیر تک ان کو کھیل دکھلایا اور جب تک وہ خود ہی نہ ہٹ گئیں اس وقت تک آپ برابر کھڑے ہوکر ان کو کھیل دکھلاتے رہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بچپن کی وجہ سے گڑیوں کے کھیل کا بہت شوق تھا اور محلہ کی لڑکیاں بھی ان کے پاس کھیلنے کے لیے آتی تھیں۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گھر میں تشریف لاتے تو وہ لڑکیاں متفرق ہوجاتیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کو جمع کرکے پھر لاتے کہ آؤ بھاگتی کیوں ہو جس طرح کھیلتی تھیں کھیلتی رہو۔ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کے ساتھ مسابقت (۱) بھی کی کہ دیکھیں کون آگے نکلتا ہے۔ اس وقت حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہلکی پھلکی تھیں وہ آگے نکل گئیں۔ کچھ عرصہ کے بعد دوبارہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر مسابقت کی، اس وقت حضرت عائشہ کا بدن بھاری ہوچلا تھا اس مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آگے نکل گئے، تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمایا کہ اس کا بدلہ ہے۔ بتلایئے کنواری بچی کی دلجوئی اور دل داری اور اس کے جذبات عمر کی رعایت بڑھاپے میں کوئی مرد اس طرح کرسکتا ہے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کی۔ حاشا وکلا (۲) بوڑھوں سے یہ بہت دشوار ہے مگر ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بڑھاپے میں حضرت عائشہؓ کے ساتھ وہ برتاؤ کیا جو جوان شوہر کو جوان بی بی کے ساتھ کرنا چاہیے بلکہ کوئی جوان بھی اتنا نہیں کرسکتا جتنا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کے ساتھ کیا۔ آج کل جو لوگ وقار وقار پکارتے ہیں یہ وقار تکبر کا پوٹلہ ہے ان لوگوں نے تکبر کا نام وقار رکھ لیا ہے۔ یاد رکھو وقار کے خلاف کام وہ ہے جس میں دین پر بات آتی اور جس میں دین کی مصلحت پر کوئی اثر نہ پہنچے محض اپنی عرفی سبکی (۳) ہوتی ہو تو ایسا کام کرنا عین تواضع ہے، آج کل جو لوگ وقار کا پوٹلہ بغل میں دبائے ہوئے ہیں وہ بیوی کے ساتھ دوڑنے کو خلاف وقار سمجھیں گے مگر وہ ذرا زبان سنبھالیں اور آنکھیں کھول کر دیکھیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کے ساتھ مسابقت کی ہے تو کیا معاذ اللہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

(۱) دوڑ لگائی (۲) ہرگز نہیں (۳) شرمندگی

کے فعل کو بھی خلاف وقار سمجھتے ہیں ہرگز نہیں اور اگر کوئی ایسا کہے تو اس کے ایمان کی خیر نہیں یقیناً حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فعل خلاف وقار نہ تھا ہاں تکبر کے خلاف ضرور تھا۔ پس اگر آج کل مدعیان وقار متکبر نہیں ہیں تو ذرا وہ ہم کو بیوی کے ساتھ دوڑ کر کے دکھلائیں مگر ان سے قیامت تک ایسا نہ ہوسکے گا ہاں جو شخص متکبر نہ ہوگا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا متبع ہوگا وہ ایسا ضرور کرسکتا ہے اور بحمد اللہ ہم نے بھی اس سنت پر عمل کیا ہے۔ ایک حکمت یہ تھی کہ عورتوں کے متعلق جو خاص احکام ہیں ان میں عورت کا واسطہ ہونا زیادہ نافع (۱) اور موجب سہولت ہوسکتا ہے۔

ترک لذات زہد کے لیے لازمی نہیں

دوسری عورتوں کے لیے پھر وہ احکام جن امور کے متعلق ہیں ان میں عادات عورتوں کی مختلف ہوتی ہیں تو یہ نہایت مصلحت کی بات ہے کہ وہ وسائط متعدد (۲) ہوں تاکہ ہر قسم کے احکام سہولت سے ظاہر ہوسکیں اور ظاہر ہے کہ منکوحہ کے برابر کوئی بے تکلف واسطہ نہیں ہوسکتا۔ غرض یہ حکمتیں تھیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعدد نکاحوں میں اور یہ بھی نمونہ کے طور پر چند بیان کردی گئی ہیں ورنہ اور بہت سی حکمتیں ہیں جن کے بیان کو عمر طویل چاہیے ان وجوہ سے آپ نے متعدد نکاح کئے ہیں ورنہ اگر آپ چاہتے تو بالکل صبر کرلیتے اور جس طرح ساری جوانی ایک چالیس سالہ بیوہ کے ساتھ آپ نے گزار دی بوڑھاپے کو بھی ایک بیوی کے ساتھ گزار سکتے تھے۔ مگر آپ نے ان حکمتوں کی وجہ سے جن کا ابھی ذکر ہوا ہے متعدد نکاح کیے جس سے یہ ثابت ہوگیا کہ ترک لذات زہد کے لیے لازم نہیں بلکہ صرف تقلیل لذات (۳) کافی ہے ورنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ترک نکاح ضرور کرتے۔ دوسرے یہ کہ مجاہدات وریاضات سے مقصود کسر قوت بہیمیہ (۴) ہے اور وقاع (۵) سے یہ کسر زیادہ حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں آتا ہے۔ من استطاع منکم الباءة فلیتزوج فانه اغض للبصر واحصن للفرج ومن لا فلیصم فانه له وجاء (۶) اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح صوم سے کسر قوت بہیمیہ ہوتی ہے اسی طرح نکاح سے بھی یہ قوت منکسر ہوتی ہے بلکہ نکاح کو اس میں زیادہ دخل ہے اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو مقدم فرمایا۔

(۱) مفید (۲) کئی واسطے ہوں (۳) لذتوں میں کمی کرنا (۴) قوت حیوانی کو توڑنا (۵) جماع (۶) الصحیح للبخاری ۳/۳۴، الصحیح لمسلم کتاب النکاح:۱

شکم سیر (۱) ہوکر کھانے سے روح صوم باطل نہیں ہوتی

غرض ثابت ہوا کہ ترک وقاع مجاہدہ نہیں ہے ایک تتمہ سابق کا اور بھی ہے وہ یہ کہ میں نے پہلے بیان میں یہ بھی کہا تھا کہ تقلیل طعام (۲) کے لیے غذا کم کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ فصل بین الاکلتین (۳) مجاہدہ کے لیے کافی ہے اس کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اس وقت رمضان کا اخیر ہے سب دیکھ لیں تو صرف اس فصل ہی کی وجہ سے مجاہدہ کے آثار سب پر نمایاں ہورہے ہیں۔ چنانچہ اس وقت سب کی قوت میں کمی معلوم ہورہی ہے۔ سب لوگ ڈھیلے ڈھیلے ہورہے ہیں باوجودیکہ افطار وسحر میں خوب کھاتے پیتے تھے مگر پھر بھی روزہ نے اپنا اثر دکھادیا۔ ابتداء رمضان میں شبع بھی زیادہ تھا اور اب وہ بھی بہت کم ہے پس جن فلسفی مذاق صوفیاء نے یہ لکھا ہے کہ جو شخص رمضان میں بھی اور دنوں کی طرح پیٹ بھر کر کھاتا رہے اس نے روح صوم کو باطل کردیا یہ ان کی اجتہادی غلطی ہے جس کا منشا صرف یہ ہے کہ انہوں نے یہ سمجھا کہ مقصود صوم سے کسرت قوت بہیمیہ ہے (۴) سو جب رات کو خوب پیٹ بھر کر کھایا تو یہ کسر کہاں حاصل ہوا۔ سو اول تو خود یہ حکمت اجتہادی ہے اس کے انتفاء (۵) سے روح صوم کو باطل کہہ دینا رائے محض ہے اور اس رائے سے ابہام ہوتا ہے کہ اگر رات کو شبع (۶) کے ساتھ غذا ہو تو صوم ہی کا ثواب نہ ملے گا کیونکہ بدون روح کے محض صورت بیکار ہے اور یقینا غلط ہے کہ جس شخص سے کوئی معصیت سرزد نہ ہو اس کا ثواب کم ہوجاوے، دوسرے بعد تسلیم کسر (۷) اس صورت میں بھی حاصل ہے اور یہ غیر مسلم ہے کہ کسر کے لیے شب کا شبع (۸) بھی مضر ہے اس لیے یقینا کہا جاوے گا کہ پیٹ بھر کر کھانے سے روح صوم ہرگز باطل نہیں ہوتی۔ چنانچہ مشاہدہ ہمارے سامنے ہے کہ باوجود شب کے شبع کے سب کی قوت بہیمیہ منکسر ہورہی ہے (۹)۔ خصوصاً جبکہ شریعت میں اس قول کی کوئی اصل نہیں ملتی۔ چنانچہ شاہ

(۱) پیٹ بھر کر کھانے سے (۲) کھانے میں کمی (۳) دو وقت کے کھانے میں فاصلہ کردینا ہی کافی ہے (۴) حیوانی قوت کو توڑنا (۵) نہ پائے جانے سے (۶) پیٹ بھر کھانے (۷) یہ اصول تسلیم کرنے پر بھی قوت بہیمیہ کا ٹوٹنا پھر بھی ثابت ہے (۸) یہ بات قابل تسلیم نہیں کہ رات کو پیٹ بھر کر کھانے سے قوت بہیمیہ میں کمی واقع نہ ہو (۹) رات کو پیٹ بھر کر کھانے کے باوجود سب کو کمزوری ہورہی ہے۔

ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس کی تصریح کی ہے باقی احادیث میں جو جوع (۱) کی فضیلت آتی ہے وہ ایسی ہے جیسے مرض کی فضیلت آئی ہے تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قصداً بیمار ہوا کریں اسی طرح یہ لازم نہیں کہ قصداً بھوکے رہا کریں اسی طرح جو شبع کی مذمت وارد ہے اس سے مراد شبع مفرط ہے (۲) جس کو فقہاء نے بھی منع کیا ہے۔ مطلق شبع مراد نہیں ورنہ اگر مطلق شبع منکسر ہوتا (۳) تو حدیث میں صائم کو شکم سیر (۴) کرنے کی فضیلت وارد نہ ہوتی کیونکہ منکر پر (۵) اعانت کرنا فضیلت کیسے ہوسکتا ہے اس پر شاید کوئی یہ شبہ کرے کہ یہ کیسا مجاہدہ ہے کہ ایک ماہ کو تو دن میں کھانا پینا بند کر دیا پھر سال بھر کے لیے چھوڑ دیا کہ اب گیارہ مہینے رات دن کھاؤ پیو۔

ایک ماہ کا مجاہدہ اصلاح نفس کے لیے کافی ہے

میں کہتا ہوں کہ یہ تو میرے اس قول کی تائید ہے کہ مجاہدہ خود مقصود نہیں بلکہ مقصود عمل ہے اسی واسطے شریعت نے سال بھر میں ایک مہینہ مجاہدہ کے لیے مخصوص کیا ہے باقی ایام میں مجاہدہ مقرر نہیں کیا بلکہ وہ اس عمل کا زمانہ ہے جس کے لیے مہینہ بھر مجاہدہ کیا اور میں بقسم کہتا ہوں کہ یہ ایک مہینہ کا مجاہدہ ہی اصلاح نفس کے لیے کافی ہے اس کا اثر سال بھر رہتا ہے بشرطیکہ رمضان کو اس کے حقوق کے ساتھ پورا کیا جائے۔ تجربہ ہے کہ جن کاموں کی عادت رمضان میں کر لی جاتی ہے سال بھر کے لیے وہ کام آسان ہوجاتا ہے۔ پس جو شخص رمضان میں تقلیل کلام تقلیل منام تقلیل اختلاط (۶) کا عادی ہوجائے گا سال بھر اس کو یہ کام آسان رہیں گے بشرطیکہ اس کا ارادہ بھی کرتا رہے اور نفس کی نگہداشت سے غافل نہ ہو ورنہ قصداً گناہ کرنے کا تو کچھ علاج ہی نہیں۔ غرض اگر رمضان کو اچھی طرح گزارا جائے تو واللہ سال بھر معاصی سے بچنا آسان ہوجاتا ہے۔ بشرطیکہ گناہ سے بچنا بھی چاہے اور جو بچنا ہی نہ چاہے تو اس نے مجاہدہ کا قصد ہی نہیں کیا۔ پس تم رمضان میں مجاہدہ کا قصد کرو اور اصلاح نفس کا اہتمام کرو پھر اگر تم

(۰) فاقہ کی یعنی بھوک کی (۲) اس سے مراد زیادہ کھانا یعنی پیٹ تن کر کھانا (۳) اگر پیٹ بھر کر کھانے کی ممانعت ہوتی (۴) پیٹ بھر کر کھلانے کی (۵) ممنوع کام (۶) کم گوئی، کم سونے اور کم ملنے جلنے کا۔

گناہوں سے بچنا چاہو گے تو دیکھ لینا کتنی آسانی ہوتی ہے۔ غرض مجاہدہ خود مقصود نہیں بلکہ اصل مقصود عمل ہے اور مجاہدہ تسہیل عمل کے لیے مشروع ہوا(۱) ہے جیسے مسہل (۲) معدہ کو نرم کرنے کے لیے دیا جاتا ہے تاکہ مادہ متعفنہ (۳) نکل کر معدہ کی اصلاح ہو جائے اور ظاہر ہے کہ مسہل روز روز نہیں ہوا کرتا، سال بھر میں ایک دفعہ ہوتا ہے کہ معدہ درست ہو جائے تو سال بھر غذا کھائی جائے اور اس کے ہضم سے قوت حاصل کی جائے۔ اسی طرح شریعت نے مجاہدہ کا زمانہ ایک ماہ رکھا ہے اور اس کو بھی عمل سے خالی نہیں رکھا بلکہ ہر مجاہدہ کے ساتھ ایک عمل ضرور رکھا ہے باقی مہینے خالص عمل کے لیے رکھے تاکہ معلوم ہو کہ اصل مقصود عمل ہی ہے یہ علوم جواہرات ہیں ان کی قدر کرو، واللہ ان سے بہت سی مشکلات وعقبات حل ہو جاتے ہیں سب اصول ہیں فن کے یہ سب بیان اس پر چلا تھا کہ وقاع میں خود کسر قوت بہیمیہ ہے اس لیے اس کے ترک کو مجاہدہ میں شمار نہیں کیا گیا اور جب ترک وقاع مجاہدہ نہیں حالانکہ وہ الذالاشیاء ہے (۴) تو اس سے ثابت ہوا کہ ترک لذات کوئی مجاہدہ نہیں اور نہ ترک لذات کا نام زہد ہے اور جن لوگوں نے ترک لذات کو زہد کے لیے ضروری سمجھا ہے وہ محقق نہیں ہیں۔

ٹھنڈا پانی پینے میں حکمت

چنانچہ ایک بزرگ نے سنا کہ فلاں صوفی شوربے میں پانی ملا کر کھاتا ہے فرمایا وہ طفل مکتب ہے وہ اس تجلی کو معطل کرتا ہے جو شوربے کی لذت میں ظاہر ہے۔ ہمارے حاجی صاحبؒ کا ارشاد جو خود مجھ سے فرمایا میاں اشرف علی پانی جب پیو خوب ٹھنڈا پینا ہر بن مو سے (۵) الحمد للہ نکلے گا اور گرم پانی پیو گے تو زبان الحمد للہ کہے گی مگر دل اس کا ساتھ نہ دیگا۔ یہ ہیں حقائق جن کو محقق ہی سمجھتا ہے۔ اب بتلایئے اگر کوئی شخص ٹھنڈے پانی میں گرم پانی ملا کر پیئے تو اس نے اس نعمت کو باطل کیا یا نہیں جو ٹھنڈے پانی میں رکھی ہوئی یقینا اس نے نعمت کی ناقدری کی، اسی طرح لذیذ شوربا کھا کر جیسا دل خوش ہوتا ہے اور خوش ہو کر نعمت الٰہی کا شکر کرتا ہے پانی ملانے کے بعد وہ

(۱) عمل میں سہولت کی وجہ سے شریعت نے اس کا حکم دیا ہے (۳) دست لانے والی دواء (۴) بدبودار خراب مواد (۵) سب چیزوں سے زیادہ لذیذ (۱) تمہارے بال بال سے

بات کہاں حاصل ہوسکتی ہے ہرگز نہیں، عارف ہر چیز کے حقوق ادا کرتا ہے، ٹھنڈے پانی کے بھی اور لذیذ شوربے کے بھی اور نفیس کپڑے کے بھی اور ناقص ان کے حقوق کو ضائع کرتا ہے۔ ایک بزرگ کا ارشاد ہے کہ ہم تو عطر اس واسطے ملتے ہیں تاکہ خدا تعالیٰ کو اچھے لگیں، عمدہ کپڑے اس واسطے پہنتے ہیں تاکہ خدا کو اچھے لگیں کیا کہنا ہے ان بزرگوں کی حالت اور نیت کا یہ ہر کام میں رضائے محبوب ہی کا قصد کرتے ہیں عام لوگ ان کی حالت کو کیا پہچانیں۔

در نیابد حال پختہ ہیچ خام پس سخن کو تاہ باید والسلام(۱)

فکر موت کے ساتھ ایک بزرگ دین کی قوت کی گولی کا استعمال

مگر تم ان کی ریس مت کرنے لگنا کہ آج ہی سے عمدہ عمدہ کپڑوں کا اہتمام کرنے لگو کیونکہ اول تو وہ حضرت فناء نفس سے مشرف ہو چکے تھے دوسرے ان کاموں کے لیے اہتمام نہ کرتے تھے، ہاں جب خدا نے عمدہ کھانے، عمدہ پہننے کو دیا تو اس کو اچھی نیت سے استعمال کرتے تھے، ہر شخص کو ان کی ریس نہ کرنی چاہیے ورنہ وہی حال ہوگا جو ایک بادشاہ کا ہوا تھا۔ ایک بادشاہ نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ وہ روزانہ دو گولی کھایا کرتے ہیں، بادشاہ نے پوچھا کہ یہ گولیاں کیسی ہیں، فرمایا قوت کے لیے ہیں۔ اس نے کہا مجھے بھی ایک عنایت کر دیجئے، آپ نے ایک گولی اس کو بھی دیدی، تھوڑی دیر کے بعد جو اس نے اپنا اثر کیا تو بادشاہ سے ضبط نہ ہوسکا، محل سرا میں گیا اور اپنی بی بی اور باندیوں سے رات بھر مشغول رہا مگر کسی طرح خواہش اور قوت کم نہ ہوتی تھی۔ اب اسے خطرہ پیدا ہوا کہ ایک گولی میں تو میرا یہ حال ہوا اور یہ بزرگ مدت سے دو گولیاں روز کھاتے ہیں ان سے کیونکر ضبط ہوتا ہے ان کی حالت کا تجسس کرنا چاہیے، کہیں یہ کسی سے خراب وخستہ نہ ہوتے ہوں گو بوجہ عقیدت قدیم کے اس خطرہ کو دفع کر دیا مگر اس خطرہ کا ان بزرگ کو کشف ہوگیا اور چاہا کہ اس کو بالکل صاف کر دیا جاوے۔ بادشاہ

(۱) ''خام شخص کاملین کے حالات کو نہیں سمجھ سکتے، پس کلام مختصر کرو اور ایسے نادان اور خام سے سلام کرو، کلام نہ کرو''

اگلے دن حاضر خدمت ہوا تو انہوں نے افسوس کے ساتھ فرمایا کہ مجھ کو معلوم ہوا کہ تمہاری زندگی کے تھوڑے روز باقی رہ گئے ہیں، چالیس دن کے بعد تم مرجاؤ گے مگر چونکہ عبادت کے لیے قوت کی ضرورت ہے اس لیے یہ گولیاں پاس رکھو، روزانہ کھالیا کرو تاکہ عبادت آسانی سے ہوسکے چونکہ بادشاہ کو ان سے اعتقاد تھا اس لیے یقین آ گیا کہ بس میری زندگی کے چالیس دن باقی ہیں، پھر تو حالت یہ ہوئی کہ دو گولیاں روزانہ کھا کر بھی نفس کو مطلق ہیجان نہیں ہوتا، موت کے خیال نے نفس کو پژمردہ کر دیا اب نہ بیوی کی طرف التفات ہے نہ باندیوں کا خیال ہے، ہر وقت موت کا فکر ہے، سب کام چھوڑ چھاڑ کر گوشہ نشین ہو کر خدا کی یاد میں لگ رہا ہے۔ جب چالیس دن پورے ہو گئے اور موت نہ آئی تو بزرگ کی خدمت میں پھر حاضر ہوا اور کہا حضور چالیس دن تو گزر گئے مگر آپ کا کشف پورا نہ ہوا، فرمایا وہ گولیاں بھی کھائی تھیں کہا ہاں، فرمایا کیا ویسا ہی اثر ہوا کہا حضور خاک بھی اثر نہیں ہوا، مجھے تو ہر وقت موت کا فکر لگا ہوا تھا، فرمایا میرا مقصود تمہارے خطرہ کا جواب دینا تھا۔ دیکھو کہ تم کو تو چالیس دن کی مہلت کا بھی یقین تھا، مگر پھر بھی موت کے فکر نے تمہارا یہ حال کر دیا اور جس کو چالیس منٹ کی مہلت کا بھی یقین نہ ہو اور ہر وقت موت ہی کا دھیان لگا رہتا ہو کہ دیکھئے کب بلاوا آجاوے تو اس کا کیا حال ہوگا۔ اب بادشاہ سمجھا کہ واقعی میرے خطرے کا جواب ہو گیا، واقعی جس کو موت کا ہر دم فکر لگا ہوا ہے ان گولیوں سے کیا ہیجان ہوتا۔

علوم قلبی

صاحبو! تم تو یہ دیکھتے ہو کہ بزرگ عمدہ کھاتے، عمدہ پہنتے ہیں مگر ان کے دل پر جو آرے چلتے ہیں ان کی تمہیں کیا خبر، تم ان کو ظاہر میں خوش حال دیکھ کر اپنے اوپر قیاس کرتے ہو کہ بس یہ بھی ہر وقت تنعم میں رہتے ہیں مگر ان کے دل کی کیا خبر کہ اس پر کیا گزر رہی ہے اس لیے تم ان کی ریس نہ کرو، تمہاری سلامتی اسی میں ہے کہ عبادات میں تو ان کی تقلید کرو، احوال میں تقلید نہ کرو کیونکہ تم ان احوال کے حقوق ادا نہیں کر سکتے اور جب اس قابل ہو جاؤ گے پھر تقلید احوال کا بھی مضائقہ نہیں، میں یہ کہہ رہا تھا کہ ترک وقاع مجاہدہ نہیں ہے نہ ترک لذات کا نام زہد ہے اس پر شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ اگر ترک

وقاع مجاہدہ(۱) نہیں تو پھر روزے میں ترک اکل وشرب کے ساتھ ترک وقاع کیوں مشروع ہوا(۲) خوب سمجھ لو کہ روزہ میں ترک وقاع کے ضروری ہونے سے اس کا مجاہدہ ہونا لازم نہیں آتا بلکہ روزہ میں ترک وقاع کے مشروع ہونے کا دوسرا سبب ہے میرے یہ علوم نقلی نہیں ہیں کیونکہ میری نظر کتابوں پر بہت کم ہے اسی لیے بعض لوگ مجھے کم ہمت بھی کہتے ہیں بلکہ یہ علوم میرے قلب پر خود بخود چلے آتے ہیں جیسے ایک ڈوم کی آنکھوں میں چاند گھسا آتا تھا اس نے کہیں سن لیا تھا کہ چاند دیکھنے سے روزہ فرض ہوتا ہے اس نے کہا کہ ہم چاند ہی نہ دیکھیں گے جو روزہ فرض ہو۔ ایک دفعہ وہ تالاب کے کنارہ پر آب دست (۳) لے رہا تھا کہ پانی میں چاند کا عکس نظر آیا تو کہنے لگا گھس جا آنکھوں میں کردے روزہ فرض تو جیسے اس کی آنکھوں میں چاند خود بخود گھسا آتا تھا ایسے ہی میرے دل پر یہ علوم خود بخود چلے آتے ہیں مگر اتنا فرق ہے کہ وہ آنکھیں بند کرلیتا تھا میں کھلی رکھتا ہوں۔ تو بات یہ ہے کہ گو واقع بھی مانع مشاہدہ نہیں ہے (۴) کہ اس کے ترک کو مجاہدہ کہا جاوے بلکہ مشاہدہ پر معین (۵) ہے جیسا میں اوپر بتا چکا ہوں کہ عارفین کو اس میں بھی ایک تجلی ظاہر ہوتی ہے اور اس کا مقتضا واقع میں یہی تھا کہ ترک وقاع صوم کے لیے ضروری نہ ہوتا مگر یہ مشاہدہ بواسطہ ہے اور ترک وقاع میں مشاہدہ (۶) بلا واسطہ دوسرے وقاع میں مشاہدہ ہونا یہ حالت عارفین کے ساتھ مخصوص ہے غیر عارف کو تو اس وقت حضور بھی مشکل ہے کیونکہ اکثر لوگ تو اس وقت نفسانی لذات میں ایسے مشغول ہوتے ہیں کہ ان کو حضور حق کی طرف التفات بھی نہیں ہوسکتا۔

حدیث انه لیغان علی قلبی کا مفہوم

اور عارف کو گو اس وقت حضور ہوسکتا ہے مگر اس میں شک نہیں کہ اس کے لیے بھی یہ حضور بواسطہ ہے باقی حضور بلاواسطہ وہ ترک وقاع ہی میں ہے جیسا کہ عارف کو خلوت میں حضور بلاواسطہ (۷) ہوتا ہے اور اختلاط مع الخلق میں بواسطہ (۸) اور یہی تفسیر ہے۔

(۱) جماع ترک کرنا (۲) کھانا پینا چھوڑنے کے ساتھ جماع کے چھوڑنے کا کیوں حکم ہوا (۳) استنجاء کر رہا تھا (۴) جماع کرنا بھی مشاہدہ کو روکنے والا نہیں (۵) مشاہدہ کے لیے مددگار ہے (۶) ترک جماع میں مشاہدہ بلا واسطہ ہے (۷) تجلی باری کا استحضار (۸) مخلوق سے ملاقات کے وقت تجلی باری کا استحضار بواسطہ مخلوق ہوتا ہے۔

حدیث: ''انه لیغان علی قلبی ''(۱) کی (کہ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میرے دل پر بھی بعض دفعہ ابر سا چھا جاتا ہے ۱۲) کیونکہ انبیاء علیہم السلام کو تو خلوت میں توجہ الی الحق بلا واسطہ حاصل تھی پھر ان کو تبلیغ کے لیے مخلوق سے ملنے ملانے کا حکم ہوا تو اس میں بھی توجہ الی الحق محفوظ ہے مگر یہ توجہ بواسطہ ہے اور توجہ بلاواسطہ یقینا الذ ہے(۲) توجہ بواسطہ سے جیسے ایک تو معشوق کو بلاواسطہ(۳) آئینہ کے دیکھا جائے اس طرح کہ وہ بالکل تمہارے سامنے ہو اور ایک یہ کہ محبوب کے سامنے آئینہ رکھا ہو اور اس میں سے محبوب کی صورت دیکھی جائے گو دونوں صورتوں میں آپ محبوب ہی کو دیکھ رہے ہیں مگر یقینا دونوں میں فرق ہے۔

اسی طرح گو انبیاء کے حق میں تمام مخلوق مراۃ جمال حق ہے(۴) اور وہ مخلوق سے ملنے ملانے میں بھی توجہ الی الحق (۵) ہی رکھتے ہیں مگر یہ توجہ بواسطہ ہے جس میں وہ لذت نہیں جو خلوت میں (۶) بلاواسطہ توجہ الی الحق میں ہوتی ہے اسی تفاوت کو حضور عین سے تعبیر فرماتے ہیں۔ غرض حالت وقاع میں اول تو مشاہدہ بلاواسطہ نہیں صرف بواسطہ ہے پھر وہ بھی ہر ایک کو نہیں صرف عارف کو ہوتا ہے اس لیے روزہ میں ترک وقاع مشروع(۷) ہوا تاکہ روزہ میں حق تعالیٰ کی طرف توجہ اعلیٰ درجہ کی علیٰ وجہ الکمال پائی جاوے۔ یہ راز ہے ترک وقاع کے ضروری ہونے کا صوم میں، نہ یہ کہ ترک وقاع مجاہدہ ہے۔

روزہ میں شان تنزیہ کا ظہور ہے

دوسری بات یہ ہے کہ بزرگوں کے کلام میں تصریح ہے کہ روزہ میں شان تنزیہ کا ظہور ہے یعنی روزہ فی الجملہ تخلق باخلاق اللہ ہوتا ہے اس کھانے پینے کے ساتھ جماع سے بھی روک دیا گیا کیونکہ حق تعالیٰ ان افعال سے منزہ ہیں(۸) اور اس کا مقتضا یہ ہی تھا کہ پیشاب و پاخانہ سے بھی منع کر دیا جاتا مگر اس کی ممانعت اس لیے نہیں کی گئی کہ یہ تکلیف مالا یطاق (۹) تھی، انسان پیشاب پاخانہ کے تقاضے کو نہیں روک سکتا اگر اس سے

(۱) الصحیح لمسلم، الذکر، ۴۱، سنن ابی داؤد: ۵۱۵ (۲) زیادہ لذت کا باعث (۳) روبرو دیکھنا (۴) حق تعالیٰ کے جمال کا آئینہ ہے (۵) اللہ کی طرف توجہ رکھتے ہیں (۶) تنہائی میں (۷) جماع نہ کرنے حکم دیا (۸) پاک ہیں (۹) یہ ایسی بات کا حکم ہوتا جس کی آدمی طاقت نہیں رکھتا

بھی ممانعت ہوجاتی تو اینٹھ کے ایک پرانے مولوی صاحب کی مریدنیوں کا سا روزہ ہوجاتا اور ان کا خدا جانے کہاں سے یہ اعتقاد تھا کہ روزہ پاخانہ پیشاب کرنے سے بھی ٹوٹ جاتا ہے تو یہ مریدنیاں دن بھر ان کاموں سے رکی رہتیں تھیں مگر براحال ہوتا تھا، پھر افطار کے وقت دوسرے تو کھانے پینے پر گرتے تھے اور وہ مریدنیاں لوٹا لے کر پاخانہ کو بھاگتی تھیں ان کا روزہ پیشاب کرنے سے انکار ہوتا تھا(۱) اس وجہ سے استنجے کی ممانعت نہ ہوئی اکل وشرب ووقاع سے ممانعت ہوگئی(۲) نیز روزہ میں ایک اور نکتہ بھی ہے وہ یہ کہ دن بھر تو شان تنزیہ واستغناء(۳) کا ظہور ہوتا ہے اور افطار کے وقت شان عبدیت وافتقاء(۴) کا کامل ظہور ہوتا ہے اذان ہوتے ہی کیسے کھانے پینے پر گرتے ہیں اس سے بندہ کو اپنا محتاج ہونا معلوم ہوجاتا ہے پھر احتیاج کے ساتھ بندہ کے ایک نقص کا ظہور ہوتا ہے اس طرح کہ اکل وشرب کے لیے عادۃً لازم بول وبراز (۵) پس ملزوم سے لازم کی طرف ذہن منتقل ہوکر عبدیت کے اس نقص کا استحضار ہوجاتا ہے(۶) جیسے بعض مفسرین نے اسی استلزام وانتقال ذہن کی بناء پر كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ کی تفسیر میں کہا ہے اسے وکانا یبولان ویبرزان ایضاً یعنی نصاریٰ نے جو عیسیٰ علیہ السلام، مریم علیہا السلام کو خدا کا بیٹا و خدا کی بیوی بنا رکھا ہے حق تعالیٰ اس کا رد فرماتے ہیں کہ وہ دونوں تو خدا کے مقبول بندے تھے، خدا ہرگز نہ تھے، چنانچہ دونوں کھایا پیا کرتے تھے۔ یہ مفسرین کہتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ ہگتے موتتے بھی تھے اور جو شخص ہگتا موتتا ہو اس سے زیادہ محتاج کون ہوگا لیکن حق تعالیٰ نے تہذیب کی پوری رعایت فرمائی ہے کہ ملزوم پر اکتفا کرکے لازم کی طرف اشارہ فرمادیا کیونکہ اس کو تو عقلاً خود ہی سمجھ جاویں گے کیونکہ جو کھائے پئے گا وہ ہگے موتے گا بھی ضرور اس لیے کانا یبولان ویبرزان صراحۃً نہیں فرمایا(۷) تاکہ کلام میں تہذیب کی رعایت رہے اور بعض لوگوں نے كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ کی دوسری تفسیر کی وہ بے تکلف ہے اس کا حاصل وہی ہے جو اس قطعہ کا ہے۔

ابرو بادو مہ وخورشید فلک درکارند تا تونانے بکف آری وبغلفت نخوری(۸)

(۱) روکتا تھا (۲) اس لیے شریعت نے پیشاب پاخانہ کرنے سے منع نہیں البتہ جماع سے منع کیا (۳) پاکیزگی اور بے نیازی (۴) غلامی اور احتیاج کی شان کا ظہور ہے (۵) جب کھائے پیئے گا تو پیشاب پاخانہ بھی آئے گا (۶) اس سے ذہن اس طرف منتقل ہوتا ہے کہ آدمی کتنا محتاج ہے (۷) صراحتاً یہ نہیں کہا کہ وہ ہگتے موتتے تھے (۸) ''بادل اور ہوا اور آفتاب وآسمان سب اپنے کام میں لگے ہیں تاکہ تو جب روٹی ہاتھ میں لیوے تو غفلت سے نہ کھالیوے بلکہ سوچے کہ اس روٹی کے انتظام میں بادل اور ہوا اور سورج اور آسمان کی خدمات بھی شامل ہیں''

یعنی جو شخص کھانے کا محتاج ہے وہ سینکڑوں ہزاروں چیزوں کا محتاج ہے کیونکہ طعام کے لیے زمین کی ضرورت، بیلوں کی ضرورت، بیج کی ضرورت، کمیروں بالدیوں کی ضرورت، پھر آفتاب اور چاند کی ضرورت کیونکہ پیداوار بدون تمازت آفتاب ونور قمر کے نہیں ہوسکتی (۱) پھر بارش کی ضرورت پھر کھیتی پکنے کے لیے دھوپ کی ضرورت، پھر کھیتی کٹنے کے بعد جب غلہ گاہتے ہیں تو بھوسہ اور غلہ کو الگ کرنے کے لیے ہوا کی ضرورت، پھر جب غلہ گھر میں آگیا تو پیسنے والے اور پکانے والے کی ضرورت، غرض ایک روٹی کے لیے سینکڑوں ہی سامان کی احتیاج ہے تو جو شخص کھانے کا محتاج ہے حقیقت میں اس سے زیادہ محتاج کوئی نہیں اور عیسیٰ اور مریم علیہا السلام دونوں کھانے کے محتاج تھے تو پھر ایسے سراپا احتیاج خدا یا خدا کے بیٹے اور بیوی کیونکر ہوسکتے ہیں، خدا میں اور ان میں مناسبت ہی کیا وہ سراپا غنا یہ سراپا احتیاج (۲) اور اولاد کو باپ سے اور بیوی کو شوہر سے مناسبت ہونا ضروری ہے یہاں کچھ بھی مناسبت تھی۔ پھر نصاریٰ کی حماقت ہی نہیں جو ان کو عبدیت سے بڑھا کر الوہیت (۳) تک پہنچانا چاہتے ہیں۔ یہ حاصل ہے دوسری تفسیر کا واللہ اعلم۔

غرض روزہ میں شان تنزیہ کا کامل ظہور ہے اس لیے جن چیزوں کے ترک کو تنزیہ میں دخل تھا ان سے روزہ میں روک دیا گیا جس سے روکنا ہو اسی واسطے جماع سے بھی روک دیا گیا کہ ترک جماع کو بھی تنزیہ میں دخل ہے۔

اشکال وجواب

اب یہاں ایک سوال ہوسکتا ہے وہ یہ کہ معاصی کا ارتکاب بھی تو تنزیہ کے خلاف ہے تو چاہیئے کہ ان سے بھی روزہ فاسد ہوجاوے کیونکہ ان سے شان تنزیہ فوت ہوگئی حالانکہ بجز اکل وشرب ووقاع کے اور کسی فعل کو مفسد صوم میں نہیں کہا جاتا اس کا جواب یہ ہے کہ تنزیہ کا حال استغناء ہے اس کے خلاف وہ افعال ہوں گے جن میں احتیاج کی شان ظاہر ہے اور وہ انہی افعال ثلاثہ میں ہے اور دوسری معاصی گو قبح میں

(۱) پیداوار بغیر سورج کی گرمی اور چاند کی روشنی کے نہیں ہوتی (۲) وہ سراپا بے نیاز یہ سراپا محتاج (۳) بندے سے خدا بنانا چاہتے ہیں۔

اشد ہوں(۱) مگران میں احتیاج کی شان اتنی زیادہ نہیں بلکہ اگر ہے تو کبر کی شان ہے۔ چنانچہ احکام خداوندی کی سرکشی سے بڑھ کر کیا کبر ہوگا اس لیے جن گناہوں میں اکل وشرب وجماع نہ پایا جائے ان سے بچنا روزہ کا جزو اور رکن نہیں یعنی ان سے روزہ باطل بھی نہیں ہوتا گو عذاب سخت ہو کیونکہ ان سے بچنے کو تنزیہ میں (جو کہ تخلق باخلاق اللہ ہے) کوئی دخل نہیں اور روزہ نام ہے تخلق باخلاق اللہ کا اور یہی معنی ہیں حدیث ''الصوم لی وانا اجزی به''(۲) کے کہ روزہ میرے لیے ہے اور اس کی جزا میں خود دوں گا اہل ظاہر نے اس کی شرح میں یہ کہا ہے کہ روزہ میں خلوص زیادہ ہے، اس میں ریا نہیں ہوسکتی کیونکہ اس کی حقیقت ترک ہے جو کہ عدمی ہے اور ریاء وجودی میں ہوا کرتی ہے اس لیے اس کو ''لی'' فرمایا ہے یعنی اس کو میرے ساتھ خاص خصوصیت ہے بوجہ اس کے کہ اس میں غیر اللہ کے دکھلانے کی گنجائش نہیں مگر عارفین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ روزہ میں شان تنزیہ ہے اس میں تشبہ بحق وتخلق باخلاق اللہ ہوتا ہے اس سے خدا تعالیٰ کے ساتھ مناسبت ہوجاتی ہے لِیْ کی یہ تفسیر کی ہے اور یہاں سے تفسیر ہوگئی میرے ایک خواب کی بچپن کا خواب ہے۔

نماز میں شان عبدیت کا کامل ظہور ہے

میں نے خواب دیکھا کہ کسی نے مجھ سے سوال کیا کہ اس کے کیا معنی ہیں کہ روزہ اللہ کا اور نماز رسول اللہ ﷺ کی۔ میں نے جواب دیا کہ روزہ میں تنزیہ کے سبب حق تعالیٰ کے ساتھ زیادہ تشبہ ہے اس لیے اس کو اللہ کا کہا جاتا ہے اور نماز میں شان عبدیت کا ظہور ہے اور عبدیت رسول اللہ ﷺ کا مقام ہے اس لیے اس میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تشبہ ہے۔ اس جواب کی تصدیق کی گئی غرض یہ اشکال بھی رفع ہوگیا کہ روزہ میں ترک وقاع کے شروع ہونے سے اس کا مجاہدہ ہونا معلوم ہوتا ہے میں نے بتلادیا کہ اس کا سبب مجاہدہ ہونا نہیں ہے بلکہ روزہ میں ترک وقاع کے مشروع ہونے کا سبب اور ہے یہ سب تتمہ تھا سابق کا جو مقصود سے بھی غالباً لمبا ہے جیسے مور کی دم مور سے لمبی ہوتی ہے

(۱) برائی میں ان سے بڑھ کر ہوں (۲) مسند احمد: ۲/ ۲۳۴، مشکل الآثار: ۱۱۶۴۔

مگر بدنما نہیں ہوتی اس کی یہاں تک قدر ہوتی ہے کہ اس کے پر قرآن میں رکھے جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ تتمہ بھی گولمبا ہے مگر بدنما نہیں بلکہ خوشنما ہے اب میں مقصود کی طرف رجوع کرتا ہوں وہ یہ کہ تیسرا رکن مجاہدہ کا تقلیل کلام ہے(۱) اور یہ تقلیل طعام و تقلیل منام سے(۲) بھی زیادہ دشوار ہے کیونکہ کھانے میں کچھ اہتمام تو کرنا پڑتا ہے، طعام کو تیار کرنا پڑتا ہے پھر منہ چلانا پڑتا ہے، پھر ہضم کی فکر ہوتی ہے کبھی کچھ چورن وغیرہ بھی کھانا پڑتا ہے، تقلیل میں ان سب امور کی تخفیف ہے پھر کیا دشوار ہے ایک دو دفعہ زیادہ کھالے گا پھر کہاں تک کھائے گا جب ہضم نہ ہوگا تو خود ہی تقلیل طعام ہوجائے گا بخلاف بولنے کے اس میں کچھ اہتمام ہی کرنا نہیں پڑتا نہ زیادہ بولنے سے بدہضمی ہوتی ہے اس لیے اس کی تقلیل کا کوئی قوی داعی نہیں، اسی طرح سوتا ہے تو اس میں کبھی تقلیل ہوگی، آخر کہاں تک سوئے گا کبھی تو جاگے گا۔ بخلاف اس زبان کے چرخہ کے کہ اس کی کہیں انتہا ہی نہیں یہ چرخہ چلنے سے تھکتا ہی نہیں کیونکہ اس کے لیے کچھ اہتمام کرنا ہی نہیں پڑتا نہ زبان چلانے سے کچھ تعب ہوتا ہے دوسرا راز یہ ہے کہ انسان جس قدر حظوظ(۳) اختیار کرتا ہے لذت کے لیے اختیار کرتا ہے سو کلام کے سوا دوسرے جس قدر حظوظ ہیں ان میں کرنے سے لذت کم ہوجاتی ہے، پیٹ بھرنے کے بعد پھر کھانے میں مزہ نہیں آتا، نیند بھر جانے کے بعد پھر سونے میں لذت نہیں آتی بلکہ سونے سے جی گھبرا جاتا ہے مگر بولنے کی لذت ختم نہیں ہوتی بلکہ جتنا بولتے جاؤ اتنی ہی لذت بڑھتی جاتی ہے اس لیے تقلیل کلام سب سے زیادہ دشوار ہے(۴) مگر باوجود دشواری کے اس میں آزادی اس لیے نہیں دی گئی کہ زیادہ بولنے میں آفات بہت ہیں اور اس سے گناہوں میں ابتلاء بکثرت ہوجاتا ہے۔

تقلیل کلام کا مطلب

اس لیے اس کی تقلیل کو مجاہدہ(۵) کا ایک رکن قرار دیا گیا لیکن تقلیل کلام کا یہ مطلب نہیں کہ ضروری باتوں کو بھی کم کردے بلکہ مطلب یہ ہے کہ فضول کلام چھوڑ دے گو مباح(۶) ہی ہو باقی جو باتیں حرام ہیں جیسے جھوٹ اور غیبت و بہتان وغیرہ وہ تو اس

(۱) کم بولنا (۲) کم کھانے اور کم سونے سے (۳) مزیدار چیزیں اختیار کرتا ہے (۴) کم بولنا سب سے مشکل ہے (۵) اس کی کمی کو مجاہدہ کا رکن کہا گیا (۶) اگرچہ جائز گفتگو ہو

سے خود ہی چھوٹ جائیں گے کیونکہ وہ تو مجاہدہ حقیقیہ ہے۔ جو شخص مجاہدہ حکمیہ کرے گا وہ مجاہدہ حقیقیہ کو کیسے ترک کرسکتا ہے۔ رہا ضروری کلام سو اس کا ترک کرنا جائز نہیں کیونکہ اس سے یا ضروریات میں حرج یا مخاطب کو تکلیف ہوگی بعض لوگ غلو کے سبب ضروری کلام میں بھی تقلیل (۱) کرتے ہیں کوئی بات پوچھے تو پورا جواب ہی نہیں دیتے۔ بس آدھی بات منہ میں ہوتی ہے اور آدھی پیٹ میں اور وظیفے کے اندر تو بولنا حرام ہی سمجھتے ہیں خواہ کوئی کیسی ہی ضروری بات ہو مگر یہ ایسی چپ سادہ کر بیٹھتے ہیں کہ جواب ہی نہیں دیتے بس ہوں ہوں کئے جاتے ہیں نہ معلوم اس سے کیا مراد ہے ہمارے علم میں تو چھوٹے بچے ہگنے موتنے کو بتلانے کے واسطے ہوں ہوں کیا کرتے ہیں جب ان کو پیشاب یا پاخانہ کا تقاضا ہوتا ہے اس وقت ایسے اشارے کرتے ہیں شریعت مقدسہ نے ضروری کلام کے واسطے نماز تک قطع (۲) کرنے کا حکم دیا ہے مثلاً کوئی اندھا جارہا ہو اور اس کے سامنے گڑھا ہو جس میں اس کے گرنے کا اندیشہ ہے تو اگر تم نماز بھی پڑھ رہے ہو، تب بھی واجب ہے کہ اندھے کو گرنے سے بچاؤ نماز کو توڑو اور اس سے کہو کہ ذرا بچ کر چلے آگے گڑھا ہے۔

اگر بینم کہ نابینا وچاہ است اگر خاموش بنشینم گناہ است (۳)

ایسے وقت میں خاموشی گناہ ہے بلکہ نماز توڑ کر نابینا کو گڑھے میں گرنے سے بچانا واجب ہے مگر آج کل کے وظیفے نماز کو تو چاہے توڑ دیں مگر وظیفے کو نہیں توڑ سکتے۔ اس میں بات کرنے کی مجال نہیں چاہے کسی پر کچھ ہی آبنے، اللہ بچائے ایسے وظیفوں سے، آج کل وظیفوں کے ساتھ قرآن سے بھی زیادہ ادب کا معاملہ کیا جاتا ہے کہ قرآن پڑھتے ہوئے تو دنیا کی ہزار باتیں کرلیں اور وظیفہ پڑھتے ہوئے دین کی بھی ضروری بات نہ کریں۔ شریعت نے ضرورت کی یہاں تک رعایت کی ہے کہ اگر بلی کتے سے تمہارا نقصان چار آنے سے زیادہ کا ہوتا ہے تو نماز کو توڑ کر اپنے مال کی حفاظت کرلو، شریعت پر چلنے والا کہیں نہیں اٹک سکتا اس کو قدم قدم پر شریعت کی وسعت کا اندازہ ہوتا رہتا ہے اور کیوں نہ ہو شریعت کا دعویٰ ہے۔ ''مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ'' کہ خدا نے تمہارے اوپر دین میں کچھ بھی تنگی

(۱) کمی (۲) توڑنے (۳) ''اگر میں دیکھوں کہ نابینا کے سامنے کنواں ہے پھر بھی خاموش رہوں اور نہ بتاؤں تو گناہ ہے''

نہیں کی، نفی الحرج میرا ایک وعظ ہے جو الٰہ آباد میں ہوا تھا اور پہلے اس کے تمام ہونے کے لیے دعا بھی کرائی تھی اب وہ پورا ہو چلا ہے اور مطبع والے کہتے ہیں کہ جلدی طبع ہو جائے گا وہ اس مضمون میں بہت ہی کافی ہے۔ امید ہے کہ اب وہ جلدی طبع ہو جائے گا۔ یہ وعظ مولوی سعید احمد مرحوم کا ضبط کیا ہوا ہے مگر تسوید تفصیلی کا ان کو موقع نہیں ملا، دوسرے لوگوں نے صاف کیا ہے مرحوم کے اشارے بھی بہت کافی ہوتے ہیں اس لیے کام چل گیا ورنہ صاف کرنے والے نے تو محض پنسل پر سیاہی پھیر دی ہے، تفصیل کچھ نہیں کی۔ غرض شریعت میں تنگی بالکل نہیں ہے اسی لیے ضروری کلام کا ترک کرنا ممنوع ہے کیونکہ اس سے دوسرے لوگوں کو ایذا اور پریشانی ہوتی ہے اور شریعت مخلوق کو تکلیف سے بچانا چاہتی ہے اس لیے حکم ہے کہ اگر بیٹا نفل نماز پڑھ رہا ہو اور والدین میں سے کوئی پکارے تو دیکھے کہ ان کو اس کا نماز میں ہونا معلوم ہے یا نہیں اگر انہیں معلوم ہے کہ بیٹا نماز پڑھ رہا ہے اور پھر بھی پکار رہے ہیں تو نہ بولے کیونکہ جان کر پکارنا ان کی شرارت ہے اور اگر ان کو معلوم نہیں کہ بیٹا نماز پڑھ رہا ہے تو بول پڑے اور نماز کا بعد میں اعادہ کر لے یہ مسئلہ فقہاء نے حدیث سے سمجھا ہے۔ واقعی دو فرقے اُمت کے لیے رحمت ہیں ایک فقہاء دوسرے صوفیاء۔

جریج عابد کی حکایت

فقہاء نے اس مسئلہ کو حدیث جریج سے مستنبط کیا ہے جریج بنی اسرائیل کا ایک عابد تھا۔ ایک دفعہ یہ اپنے صومعہ میں نماز پڑھ رہا تھا کہ اس کی ماں کسی ضرورت سے آئی اور اس نے صومعہ کے نیچے کھڑے ہو کر آواز دی، جریج جریج، یہ نماز پڑھ رہا تھا اس نے دل میں حق تعالیٰ سے عرض کیا کہ اے اللہ میں نماز میں ہوں اور میری ماں پکار رہی ہے یعنی جواب دینے سے معذور ہوں، غرض نماز میں مشغول رہا۔ اس نے پھر آواز دی، جریج نے پھر وہی کیا اللھم امی وصلاتی اور بدستور نماز میں مشغول رہا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس واقعہ کو بیان فرما کر ارشاد فرماتے ہیں: ''لوکان فقیھا لا جاب امه'' اگر جریج فقیہ ہوتا تو اپنی ماں کے پکارنے کا جواب دے دیتا اس لیے فقہاء نے سمجھا کہ

والدین کے پکارنے پر نماز میں بول پڑنا جائز ہے۔ بشرطیکہ ان کو اس کا نماز میں ہونا معلوم نہ ہو یہ قید دوسرے دلائل کی وجہ سے بڑھائی گئی۔ جریج کی ماں نے اس موقع پر اپنے بیٹے کو کوسا بھی تھا، جب اس نے کئی آوازیں دیں یہ نہ بولا تو اس نے بددعا دی ''اللھم لا تمت حتی تریہ وجوہ المومسات'' یعنی خداوند اسے اس وقت تک موت نہ دیجیو جب تک یہ کسی فاحشہ کا منہ نہ دیکھ لے، معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں دینداری بہت ہی زیادہ تھی کہ رنڈی کا منہ دیکھنا اس زمانہ میں بددعا اور کوسنے میں بیان کیا جاتا تھا گویا غیر عورت کا منہ دیکھنا مردوں کے لیے بہت ہی بڑا عیب سمجھا جاتا تھا، جبھی تو اس کو کوسنے میں بیان کیا اور آج کل منہ دیکھنا تو کیا اس سے منہ کالا کرنا بھی عیب نہیں سمجھا جاتا۔

اسی لیے عورتوں پر مشہور ہے کہ مرد تانبہ ہے اور عورت موتی ہے۔ تانبہ تو دس مرتبہ سیاہ ہوجائے تو قلعی سے پھر ویسا کا ویسا ہی ہوجاتا ہے اور موتی کی ایک دفعہ آب جاتی رہے تو پھر کسی طرح اس میں آب پیدا نہیں ہوسکتی۔ مطلب یہ ہے کہ مرد تو غیر عورت سے چاہے کتنی دفعہ منہ کالا کرلے چند دن کے بعد جب بات رفع دفع ہوجاتی ہے پھر ویسا کا ویسا ہی ہوجاتا ہے اور عورت اگر غیر مرد کے سامنے ایک دفعہ آجائے تو ساری عمر کو اس کی آبرو برباد ہوجاتی ہے عمر بھر منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتی مگر حقیقت کے اعتبار سے یہ کلام غلط ہے۔ آج کل بے حیائی بڑھ گئی ہے اس لیے مردوں میں غیر عورت کے پاس جانا کوئی عیب نہیں رہا اگر حیا ہوتی تو مرد بھی عورت کے طرح ایک دفعہ بے حیائی کا کام کرکے عمر بھر کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہتا۔ پس حقیقت میں مرد و عورت دونوں کی آبرو موتی ہی جیسی ہے مگر بے حیائی کے غلبہ نے مردوں کو تانبہ بنادیا ہے اور اگر یہی حال بے حیائی کا رہا تو چند دنوں میں عورتیں بھی موتی نہ رہیں گی وہ بھی مردوں کی طرح تانبہ ہوجائیں گی۔ چنانچہ ایسے قصے ہونے لگے ہیں کہ مرد نے بیوی کو تین طلاق کے بعد پھر گھر میں ڈال لیا اور وہ خوشی خوشی اس کے گھر میں رہتی ہے اور بے حیائی کو گوارا کرتی ہے اور پھر خاصہ منہ لے کر برادری کے سامنے آتی ہے اور برادری کی عورتیں اس سے اسی طرح ملتی ہیں جس طرح تین طلاق سے پہلے ملتی تھیں، کچھ ٹھکانا ہے اس بے حیائی کا (اگر یہی حال رہا تو کچھ دنوں میں کھلم کھلا بدکاری کرنے کے بعد بھی عورت مرد

کے گھر میں خاصی طرح رہا کرے گی اور کوئی بھی اس کی بدکاری پر التفات نہ کرے گا کیونکہ تین طلاق کے بعد شوہر کے پاس رہنے میں اور بدکاری میں فرق ہی کیا ہے اللہ بچائے اس فتنہ سے ۱۲ جامع) غرض جریج کی ماں نے اس کو یہ کوسنا دیا کہ خدا اسے موت سے پہلے فاحشہ عورت سے پالا ڈالے، بددعا قبول ہوگئی اور ایک فاحشہ عورت جریج کے پیچھے پڑی اور اس کے صومعہ(۱) میں آکر بدکاری پر اسے برانگیختہ کرنا چاہا یہ شخص متقی تھا اس نے دھمکا کر اسے نکال دیا اس نے کہا کہ میں تجھ کو بدنام کر کے رہوں گی بڑا متقی بنا ہے۔ چنانچہ جنگل کے کسی چرواہے سے اس نے منہ کالا کیا جس سے حمل رہ گیا، جب بچہ پیدا ہوا تو لوگوں نے پوچھا یہ بچہ کس کے زنا سے ہوا اس نے جریج کا نام لے دیا۔ بس اب لوگ کہاں تھے بلاتحقیق گمان پکالیا(۲) اور جریج کے صومعہ پر جا چڑھے اور لگے اس کو ڈھانے، جریج اندر سے نکلا اور لوگوں سے کہا کہ میرے صومعہ کو کیوں گراتے ہو کہا کمبخت تو اس قابل نہیں کہ صومعہ میں رہے تو زنا کار بدکار ہے اور ظاہر میں متقی بنا ہوا ہے اس نے پوچھا کہ آخر تم سے کس نے کہا کہ میں زانی ہوں، لوگوں نے اس عورت کو معہ بچہ کے پیش کیا کہ دیکھ یہ عورت کیا کہتی ہے کہ تو نے اس سے زنا کیا اور یہ بچہ تیرے زنا کا ہے، جریج نے کہا کہ ذرا ٹھہرو ابھی معلوم ہو جاتا ہے اس کے بعد اس نے وضو کیا اور دو رکعت نماز پڑھی، پھر اس بچہ کے سر پر ہاتھ پھیرا اور کہا اے بچہ خدا کے حکم سے بول اور بتلا کہ تیرا باپ کون ہے خدا تعالیٰ نے بچہ کو گویائی عطا فرمائی اس نے کہا میرا باپ فلاں چرواہا ہے، اب تو سب کو یقین ہوگیا کہ یہ عورت جھوٹی ہے اور اس نے چرواہے سے منہ کالا کر کے جھوٹ موٹ جریج کا نام لیا ہے، اتنی بڑی کرامت کے بعد کیا شبہ ہوسکتا تھا بس سب کے سب جریج کے قدموں پر گر پڑے کہ ہماری خطا معاف کرو ہم نے بلاتحقیق تم کو متہم کیا(۳) اور اب ہم تمہارا صومعہ سونے کی اینٹوں سے بنادیں گے۔ اس نے کہا نہیں جیسا پہلے تھا تم ویسا ہی بنادو، غنیمت ہوا کہ جریج کی ماں نے اتنی ہی بددعا کی تھی کہ خدا اسے رنڈی کا منہ دکھادے آگے اور کچھ نہ کہا تو جریج نے رنڈی کا منہ ہی دیکھا اور کچھ نہ ہوا اس لیے والدین کی بددعا سے ڈرنا چاہیے مگر ناحق کی بددعا نہیں لگتی اور یہاں جوام جریج (۴)

(۱) عبادت خانہ میں (۲) بلاتحقیق یقین کرلیا (۳) الزام لگایا (۴) جریج کی ماں

کی بدعا لگ گئی تو وہ ناحق بددعا نہ تھی بلکہ جریج کے نہ بولنے سے اس کو ایذا ہوئی (۱) اور ایذا میں جریج کے فعل کو بھی دخل تھا کہ اس نے بے موقع سکوت کیا گو وہ بوجہ جہل کے اس سکوت میں معذور ہو مگر نفس جہل خود ایک جرم ہے اس لیے بددعا لگ گئی اور اس کی معذوری کا یہ اثر ظاہر ہوا کہ جلدی ہی برأت ہوگئی اور جن کو سوءِ عقیدت ہوئی تھی ان کو پھر حسن عقیدت ہوگئی۔

عوام کے اعتقاد کا کچھ اعتبار نہیں

اور یہاں سے ایک بات بھی ثابت ہوگئی جس کو ہمارے استاد مولانا محمد یعقوب صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ عوام کے اعتقاد کا کچھ اعتبار نہیں بیوقوف آدمی خواہ مخواہ لوگوں کے اعتقاد سے خوش ہوتا ہے کہ میرے اتنے معتقد ہیں ان عوام کے اعتقاد کی ایسی مثال ہے جیسے گدھے کا خاص عضو کہ کبھی تو اتنا بڑھتا ہے جس کی حد نہیں اور کبھی ایسا غائب ہوتا ہے کہ پتہ بھی نہیں چلتا کہ یہ گدھا ہے یا گدھی۔ چنانچہ عوام نے محض ایک فاحشہ کے قول پر بلا دلیل جریج کے صومعہ کو ڈھانا شروع کر دیا۔ مدت دراز کا اعتقاد ذرا سی بات میں بالکل غائب ہوگیا اور جب اس کی کرامت سے بچہ بول پڑا تو پھر ایسے معتقد ہوئے کہ اس کا صومعہ سونے کی اینٹوں سے بنانے پر تیار ہوگئے اس لیے عوام کے اعتقاد کا کبھی اعتبار نہ کرنا چاہیے بلکہ معیار کسی کی حقیقت کمال کا یہ ہے کہ اہل نظر اس کے کمال کے معتقد ہوں۔ صائب نے خوب کہا ہے:

بنمائے بصاحب نظر گوہر خودرا عیسیٰ نتواں گشت بتصدیق خرے چند (۲)

غرض شریعت نے ضرورت کی اتنی رعایت کی ہے کہ ضرورت کے وقت نفل نماز توڑنے کی توسع کے ساتھ اجازت ہے اور بعض شرائط کے ساتھ فرض نماز توڑنے کی بھی اجازت ہے جیسے اندھے کے گرنے کا اندیشہ ہو اس لیے تقلیل کلام (۳) کا یہ مطلب نہیں کہ آدمی ضروری باتیں بھی نہ کیا کرے لیکن ضرورت کی تفسیر سمجھ لینی چاہیے کہیں آپ سب باتوں کو ضرورت ہی میں نہ داخل کرلیں، بعضے ایسے وہمی بھی ہیں جن کو یہ سنکر کہ یہ

(۱) تکلیف (۲) ''اے شخص اپنے موتی کو کسی اہل نظر کو دکھا چند گدھوں کی تصدیق سے کوئی عیسیٰ نہیں ہوسکتا'' (۳) کم گوئی

ضروری باتوں کو ترک نہ کرنا چاہیے بات بات میں ضرورت کا وہم (۱) پیدا ہوگا کہ یہ بات ضروری معلوم ہوتی ہے پھر ان کے نزدیک غیر ضروری بات کوئی بھی نہ رہے گی تو ضرورت کی تفسیر سنئے (اور یہ جواہرات کا ٹکڑا ہے اس کی قدر کرو کتابوں میں سر مارنے سے یہ جواہرات نہ ملیں گے)

ضرورت کی تفسیر

ضرورت کی تفسیر یہ ہے لولاہ لتضرر یعنی جس کے نہ ہونے سے ضرر ہو پس جس بات کے ترک سے دنیا کا یا دین کا ضرر ہو وہ بات ضروری ہے۔ مثلاً ایک شخص تاجر ہے اس کے پاس کوئی خریدار آئے اور گھنٹہ بھر تک چیزوں کی قیمت دریافت کرتا رہے اور تاجر کو امید ہے کہ یہ ضرور کچھ خریدے گا تو جب تک یہ امید ہو اس وقت تک خریدار سے باتیں کرنا ضرورت میں داخل ہے کیونکہ اس صورت میں خریدار سے باتیں نہ کرنے میں دنیا کا ضرر ہے، تجارت کو نقصان پہنچے گا اس لیے شریعت اجازت دیتی ہے کہ وہ دو گھنٹے بھی تجارت کی باتیں کرے تو تم اس سے باتیں کرتے رہو ہاں سچی باتیں کرو جھوٹ اور مبالغہ سے کام نہ لو کہ خواہ مخواہ اپنے مال کی حد سے زیادہ تعریف کرو تو یہ سب باتیں ضرورت میں داخل ہیں اس سے قلب میں ذرا برابر ظلمت نہیں ہوتی یا کوئی شخص آپ سے ملنے آیا اس سے باتیں کرنا مزاج پوچھنا اور یہ دریافت کرنا کہ آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں مکان سے کب چلے تھے یہاں کب تک قیام رہے گا یہ بھی ضرورت میں داخل ہے۔ بعض خشک زاہدان باتوں کو فضول سمجھتے ہیں مگر یہ لوگ فقیہ نہیں یہاں سے معلوم ہوا کہ اس بات کا سمجھنا کہ کس بات کے ترک سے ضرر ہوتا ہے اور کس کے ترک سے ضرر نہیں ہوتا یہ بھی فقہاء ہی کا کام ہے فقیہ کہتا ہے کہ اس صورت میں مہمان سے اس قسم کی باتیں کرنا ضروری ہے کیونکہ یہ سوال نہ کرنے سے اس کی دل شکنی ہوگی، دل ٹوٹے گا کہ میری بات بھی نہ پوچھی اور مسلمان کا دل سنبھالنا بھی شرع میں مقصود ہے۔ غرض ضرر کے مواقع (۲) فقہاء کے طرز پر میں کہاں تک بیان کروں اس کے لیے تو بڑے وسیع وقت کی ضرورت ہے اور پھر بھی

(۱) ہر بات کو ضروری سمجھے گا (۲) نقصان کی صورتیں

جزئیات کا احاطہ نہ ہوسکے گا، کلیات میں نے بیان کردیئے ہیں جزئیات کو تم خود نکال لو اور جن میں اس کا مادہ بالکل نہیں (۱) وہ علماء سے مل کر پوچھتے رہیں اور کبھی کچھ نہ کرسکیں تو کم از کم ان گناہوں سے تو بچتے رہیں جو زبان کے متعلق ہیں چاہے دقائق کی رعایت نہ کریں اور دقائق کی رعایت عوام تو کیا کریں گے علماء بھی خاص خاص ہی ان باتوں کو سمجھتے ہیں کہ کہاں ترک کلام سے ضرر ہوتا ہے کہاں ضرر نہیں ہوتا مگر جو باتیں گناہ کی ہیں وہ تو سب کو معلوم ہوسکتی ہیں ان کا ترک تو سب پر ضروری ہے اس لیے ذرا سی جیبا میں (جیب یعنی زبان کی تصغیر ۱۲) بیس آفات ہیں جن کو امام غزالیؒ نے احیاء میں بیان کیا ہے اور آج کل احیاء کا ترجمہ بھی ہوگیا ہے، اس کا مطالعہ کرنا چاہیے اگر اس کو طویل سمجھا جاوے تو کیمیائے سعادت کا ترجمہ اکسیر ہدایت بہت اچھی کتاب ہے اسی کا مطالعہ کرلو تو زبان کی آفات معلوم ہوں گی بس عوام کے لیے تو تقلیل کلام میں یہ درجہ کافی ہے کہ وہ زبان کے گناہوں سے بچتے رہیں اور جو خواص ہیں ان کو ضرورت و بے ضرورت کا لحاظ بھی کرنا چاہیے کیونکہ مجاہدہ بدون اس کے کامل نہیں ہوسکتا یہ تو تقلیل کلام (۲) کی حقیقت پر گفتگو تھی۔ اب میں یہ بتلانا چاہتا ہوں کہ روزہ میں تقلیل کلام کی کس طرح رعایت کی گئی ہے۔

روزہ میں تقلیل کلام کی صورت

تقلیل کلام (۳) کی ایک صورت تو یہ ہے کہ زبان کو بند کرلیا جائے روزہ میں کسی سے بات ہی نہ کی جائے یہ طریقہ ہماری شریعت میں نہیں ہے۔ پہلی شریعتوں میں صوم سکوت مشروع (۴) تھا جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ فَاِمَّا تَرَیِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا فَقُوْلِیْٓ اِنِّیْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا فَلَنْ اُکَلِّمَ الْیَوْمَ اِنْسِیًّا (۵) مگر شریعت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منسوخ کردیا اب روزے میں بالکل بات نہ کرنا مکروہ ہے بلکہ ضرورت کے موقع پر بات کرنی چاہیے کیونکہ میں پہلے بیان کرچکا ہوں کہ ضرورت کے وقت بات نہ کرنے سے حرج یا لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے

(۱) جن میں جزئیات معلوم کرنے کی صلاحیت نہیں (۲) کم گوئی (۳) چپ رہنے کا روزہ بھی سابقہ شریعتوں میں حکم تھا (۵) ''پھر اگر تم آدمیوں میں سے کسی کو اعتراض کرتا ہوا دیکھو تو کہہ دینا کہ میں نے اللہ تعالیٰ کے واسطے روزہ کی بات مان رکھی ہے سو آج میں کسی آدمی سے نہیں بولوں گی'' سورۃ مریم: ۲۶

اس لیے شریعت اسلامیہ نے صوم سکوت کو مشروع (۱) نہیں کیا کیونکہ روزے کا وقت ممتد ہے (۲) اتنے طویل سکوت سے دنیوی کاروبار بھی بند ہوجاویں گے اور بہت سے ضروری کاموں میں خلل پڑے گا، دین کے کام میں مثل وعظ وتبلیغ وغیرہ کے بند ہوجائیں گے۔ ہاں نماز میں سکوت مشروع ہے مگر نماز تھوڑی دیر کی عبادت ہے فرض نمازیں تو پانچ منٹ میں ختم ہوجاتی ہیں اور نوافل میں بھی کچھ زیادہ دیر نہیں لگتی پھر نوافل ہمارے اختیار میں ہیں جس کو ضرر کا اندیشہ ہو وہ نوافل میں مشغول نہ ہو۔ غرض نماز میں تھوڑی دیر کا سکوت ہے اس سے ضرر نہیں ہوسکتا، اتنی دیر تو آدمی ویسے بھی خاموش رہا کرتا ہے البتہ روزے میں سکوت مشروع ہوتا تو اس سے دنیوی کاروبار میں بہت حرج واقع ہوتا اس لیے شریعت نے ہمارے حال پر رحم کرکے صوم سکوت (۳) کو منسوخ کردیا مگر ایک دوسرے طریقے سے روزے میں تقلیل کلام کی رعایت کی گئی ہے اس لیے پہلے ایک مقدمہ سمجھ لینا چاہیے وہ یہ کہ قاعدہ ہے کہ نفس ایک آن میں دو طرف متوجہ نہیں ہوسکتا اسی طرح زبان بھی ایک وقت میں دو قسم کی باتیں نہیں کرسکتی۔ مثلاً جو شخص کتاب پڑھ رہا ہو وہ کتاب پڑھتے ہوئے بات نہیں کرسکتا اگر بات کرے گا تو اس وقت کتاب نہ پڑھے گا تو شریعت نے روزے میں کلام کو تو ممنوع نہیں کیا لیکن نفس اور زبان کو دوسرے کام کی طرف متوجہ کردیا۔ اس طرح کہ روزے میں تلاوت قرآن کا اور ایام (۴) سے زیادہ اہتمام کیا گیا ہے چنانچہ تراویح میں ایک قرآن ختم کرنا جبکہ کوئی عذر نہ ہو حسب قول مشہور سنت مؤکدہ کردیا گیا جس کی وجہ سے حفاظ کو خواہ مخواہ دن میں کئی مرتبہ سپارہ پڑھنا پڑتا ہے اور دور بھی کرنا پڑتا ہے۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں خود تلاوت قرآن کا اور دنوں سے زیادہ اہتمام فرما کر چنانچہ حدیثوں میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ بالالتزام دور فرمانا مصرح ہے (۵) سب مسلمانوں کو عملاً اس کی ترغیب دی ہے کہ رمضان میں تلاوت قرآن زیادہ کریں خواہ وہ حافظ ہوں یا نہ ہوں تراویح میں قرآن سناویں یا نہ سناویں پھر آپ کا ارشاد ہے کہ قرآن کے ایک حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں اور یہ بھی

(۱) چپ رہنے کے روزے کا حکم نہیں دیا (۲) طویل ہے (۳) چپ کے روزہ کا حکم منسوخ کردیا (۴) دوسرے دنوں کے مقابلے میں (۵) پابندی کے ساتھ دور کرنے کی وضاحت موجود ہے

ارشاد ہے کہ رمضان میں نفل طاعت کا ثواب فرض کے برابر ملتا ہے تو اب رمضان میں تلاوت قرآن کرنے سے ایک ایک حرف پر جو دس نیکیاں ملیں گی ان میں ہر نیکی پر فرض کام کے برابر ثواب ملے گا۔ اللہ اکبر کچھ ٹھکانا ہے اس ثواب کا اس سے بھی لوگوں کو خواہ مخواہ تلاوت کی رغبت زیادہ ہوگی۔

رمضان میں ترغیب تلاوت کا راز

غرض رمضان میں تلاوت قرآن کا شریعت نے بہت ہی اہتمام کیا ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ نزول قرآن آسمان اول پر رمضان ہی کے مہینے میں ہوا ہے پھر وہاں سے تدریجاً تیئیس سال (۱) میں نازل ہوا تو اس ماہ کو قرآن کے ساتھ خاص تعلق ہے جو دوسرے ایام کو نہیں یہی وجہ ہے کہ رمضان میں تلاوت قرآن بالمشاہدہ اور دنوں سے زیادہ آسان بھی ہے اور ظاہر ہے کہ جب انسان تلاوت قرآن میں مشغول ہوگا تو لامحالہ دنیوی باتوں میں تقلیل ہوگی (۲) کیونکہ نفس ایک آن میں دو طرف متوجہ نہیں ہوسکتا تو تلاوت قرآن کے وقت اگر توجہ کے ساتھ تلاوت ہو، دوسری باتوں کا خیال بھی نہ آئے گا ورنہ زبان تو جب تک اس میں مشغول رہے گی۔ اس وقت تک دنیوی باتوں سے رکی رہے گی اس طرح سے تلاوت قرآن کے ضمن میں تقلیل کلام (۳) ہوجائے گی۔ پھر محض یہی نہیں کہ تقلیل کلام کا مجاہدہ حاصل ہوگیا اور کوئی نفع حاصل نہ ہو بلکہ اس میں ثواب بھی اتنا ہوتا ہے کہ کسی طاعت میں اتنا ثواب نہیں کہ ہر حرف پر دس نیکیاں ملتی ہیں اور رمضان میں وہ دس نیکیاں دس فرض کے برابر ہوتی ہیں یہ تو عام ثواب ہے اور جو کوئی زیادہ مخلص ہو تو اس کو ایک حرف پر سات سو نیکیاں تک ملتی ہیں بلکہ ''وَاللّٰہُ یُضَاعِفُ لِمَن یَشَاءُ'' یعنی سات سو پر بھی انتہا نہیں بلکہ خدا تعالیٰ جس کو چاہتے ہیں اس سے بھی زیادہ دیتے ہیں۔ اب بتلایئے اگر شریعت تقلیل کلام کی وہی صورت تجویز کرتی جو اہل ریاضت میں مستعمل ہے (۴) کہ بس زبان کو گوند لگا دیا جائے اور بالکل خاموش بیٹھے رہا کریں تو یہ دولت بے شمار کیونکر حاصل ہوسکتی ہے۔ شریعت کے قربان جایئے کہ اس نے مجاہدہ

(۱) تھوڑا تھوڑا تیئیس سال میں نازل ہوا (۲) کمی ہوگی (۳) کم گوئی حاصل ہوجائے گی (۴) جو مجاہدات کرنے والے کیا کرتے ہیں۔

تقلیل کلام کی وہ صورت تجویز کی جس سے اس مجاہدہ کا فائدہ بھی حاصل ہوجائے کہ زبان گناہوں سے بچی رہے، فضول باتیں کرنے کی عادت کم ہوجائے اور اس کے ساتھ ثواب بھی بے شمار ملتا رہے اور ثواب ہی پر بس نہیں بلکہ تلاوت قرآن میں بندے کو حق تعالیٰ کا ایک خاص قرب بھی حاصل ہوتا ہے جو خاموش رہنے میں کبھی حاصل نہیں ہوسکتا کیونکہ قرآن میں ایک خاص تجلی ہے جب اس کا ظہور قلب پر ہوتا ہے تو دل میں حق سبحانہ کے سوا کسی کی گنجائش نہیں رہتی، قلب عظمت حق سے پُر ہوجاتا ہے۔ بس وہ حال ہوتا ہے:

چو سلطان عزت علم بر کشد جہاں سر بجیب عدم در کشد (۱)

پھر ان باطنی دولتوں کے ساتھ قرآن میں ایک ظاہری لذت بھی ہے جس کی وجہ سے کثرت تلاوت قرآن آسان ہوگئی اگر ذرا سا بھی ذوق ہو تو قرآن سے زیادہ کوئی کلام لذیذ نہیں اس میں وہ لذت ہے کہ جتنا پڑھتے جاؤ لذت بڑھتی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کثرت تلاوت سے جی نہیں گھبراتا، بعض خدا کے بندے روزانہ ایک ختم کرتے ہیں اگر قرآن میں لذت نہ ہوتی تو بھلا روزانہ ایک ختم ہوسکتا تھا، ہرگز نہیں بعضے دو دن میں ایک ختم کرتے ہیں بعضے دس سپارے روزانہ پڑھ کر تین دن میں ختم کر لیتے ہیں اور ایسے تو اللہ کے بندے بہت ہیں جو رمضان میں تین دفعہ قرآن شریف ختم کر لیتے ہیں۔

آخر قرآن میں کوئی تو لذت ہے جو اس کی بار بار تلاوت کرنا آسان ہے بعض کلاموں میں یہ کمال ہوتا ہے کہ ان میں بدون سمجھے بھی لطف آتا ہے قرآن میں یہ صفت سب سے زیادہ ہے اور اگر خدا نے فہم (۲) معانی کی بھی توفیق دی ہے پھر تو اس لذت کا پوچھنا ہی کیا، بعض لوگ جن کو معانی قرآن کا ذوق ہے ایک ایک آیت پر گھنٹوں وجد کرتے ہیں بعض اللہ کے بندوں نے ایک ہی آیت کے تکرار میں رات سے صبح کر دی ہے روتے جاتے ہیں اور ایک ہی آیت کو بار بار پڑھتے جاتے ہیں پھر بھی لذت ختم نہیں ہوتی اگر کوئی صحیح قرآن پڑھنے والا ہو اور اس کے ساتھ خوش آواز بھی ہو اس کا قرآن سنئے، واللہ بدون سمجھے بھی وہ لطف آئے گا جو کسی کلام میں نہ آئے گا قرآن کو صحت کے ساتھ پڑھا جائے تو ہر لہجہ میں مزہ آتا ہے ہاں موسیقی کے قواعد پر نہ پڑھنا چاہیے اس

(۱) ''جب وہ سلطان عزت جھنڈا بلند کرتا ہے تو یہ کائنات تمام عدم کے جیب میں سر ڈال دیتی ہے'' (۲) معنی کو سمجھنے کی

سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے۔

مثنوی مولانا روم رحمہ اللہ کی شوکت اور حلاوت

قرآن کے بعد مثنوی میں یہ بھی صفت ہے کہ اس کے اشعار سننے میں ہر شخص کو مزہ آتا ہے چاہے مطلب کچھ بھی نہ سمجھتا ہو اسی لیے مولانا جامی رحمہ اللہ نے کہا ہے:

مثنوی مولوی معنوی ہست قرآن در زبان پہلوی(۱)

بظاہر اس میں شبہ ہوتا ہے کہ پوری مثنوی میں تو قرآن کے مضامین نہیں ہیں پھر اس کو قرآن در زبان پہلوی کیسے کہہ دیا۔ حضرت حاجی صاحبؒ نے اس کا مطلب اور بیان فرمایا ہے کہ اس جگہ قرآن کے معنی مطلق کلام الہامی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ مولانا رومی پر غیبی واردات کا غلبہ ہوتا تھا اس وقت مثنوی کے اشعار آپ کی زبان پر جاری ہوتے تھے اور مولانا حسام الدین رحمہ اللہ ان کو لکھ لیتے تھے جب حالت فرو ہوجاتی(۲) تو اشعار کی آمد بن بھی ہوجاتی تھی۔ اسی طرح اس کی تصنیف تمام ہوئی ہے تو یہ ساری کتاب غلبہ حال میں لکھی گئی ہے اس وقت بطور الہام کے یہ کلام مولانا کی زبان سے نکلتا تھا۔ اسی لیے مثنوی میں ایک شوکت اور حلاوت(۳) ایسی ہے جو دوسروں کے کلام میں نہیں پائی جاتی یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ قرآن میں ایک لذت ہے جو بے سمجھے پڑھنے میں بھی ہر شخص کو حاصل ہوتی ہے۔

تلاوت قرآن کی صورت میں تقلیل کلام

قرآن میں ایک بات یہ ہے ''لا یخلق من کثرۃ الرد'' کہ یہ کلام بار بار پڑھنے سے پرانا نہیں ہوتا ہر دفعہ تازہ کلام معلوم ہوتا ہے کوئی غزل کیسی ہی عمدہ ہو دس مرتبہ سن لو تو پھر اس کے سننے میں مزا نہیں آتا بلکہ جی گھبرانے لگتا ہے اور قرآن کو نہ معلوم کتنی مرتبہ سنا ہوگا اور کتنی مرتبہ پڑھا ہوگا یہ پرانا نہیں ہوتا، ہر دفعہ لطف آتا ہے بلکہ بار بار ختم کرکے پھر شروع کرنے کو جی چاہتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ تلاوت قرآن کے عادی

(۱) ''یہ مثنوی مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ کی فارسی زبان میں الہامی کتاب ہے'' (۲) یہ حالت ختم ہوجاتی (۳) عظمت و مٹھاس

ہیں ان سے پوچھ لیجئے اور تم عادت کر کے دیکھ لو پھر خود ہی تجربہ ہوجائے گا جو لوگ تلاوت قرآن کے عادی ہیں اگر کسی دن ان کا معمول پورا نہ ہو اور تلاوت کا موقع نہ ملے تو دن بھر ان کا دل برار ہتا ہے جیسے بھوکے پیاسے کو روٹی اور پانی کی طلب ہوتی ہے اس طرح ان کا دل تلاوت کو ترستا رہتا ہے جب قرآن پڑھ لیتے ہیں اس وقت تسلی ہوتی ہے جیسے بھوکے کو غذا مل گئی، پیاسے کو پانی مل گیا ورنہ ماہی بے آب (۱) کی طرح تڑپتے رہتے ہیں اگر کثرت تلاوت سے قرآن پرانا ہوجایا کرتا تو یہ طلب اور یہ بے چینی کبھی نہ ہوتی خصوصاً ان لوگوں کو جو مہینہ میں کئی بار ختم کرتے ہیں مگر یہاں یہ حالت ہے کہ جو جتنا زیادہ تلاوت کا عادی ہے وہ اتنا ہی اس کے لیے بے چین ہے تو شریعت نے عجیب مجاہدہ تجویز کیا ہے جس میں تقلیل کلام کے ساتھ ظاہری لذت بھی ہے جس کی کثرت قلب پر گراں بھی نہیں ہوتی پھر اس میں قرب بھی بے انتہاء ہے ثواب بھی بے شمار ہے بھلا تقلیل کلام کی ایسی صورت کوئی بتلاسکتا ہے۔ پھر جو صورت مجاہدہ تقلیل کلام کی اہل ریاضت نے تجویز کی ہے کہ زبان کو بند کرلیا جائے اس میں ایک نقص یہ بھی ہے کہ اس طرح قوت گویائی کم ہوجاتی ہے اگر ایسا شخص کسی وقت تقریر کرنا چاہے تو اس کے کلام میں شوکت وقوت نہ ہوگی۔

قوت نطق بڑا جوہر ہے

قوت نطق انسان میں بڑا جوہر ہے زبان سے بعض دفعہ وہ کام لیے گئے ہیں جو تلوار سے نہ ہوسکتے تھے تو اس قوت کا معطل وبیکار ہوجانا بہت بڑا نقص ہے مگر شریعت نے تقلیل کلام کی جو صورت تجویز کی ہے اس سے قوت کلام بڑھتی ہے تجربہ ہے کہ کثرت تلاوت قرآن سے کلام میں بلاغت وفصاحت پیدا ہوتی ہے اور گویائی میں قوت پیدا ہوتی ہے۔

تلاوت قرآن اور قوت گویائی

تو سبحان اللہ کیا عجیب مجاہدہ ہے کہ تقلیل کلام کے ساتھ تقویت کلام (۲) مجتمع

(۱) جیسے مچھلی بغیر پانی کے تڑپتی ہے یہ بھی تڑپتے ہیں (۲) کم گوئی کے ساتھ گفتگو میں قوت عطا کردی

کردی بھلا ضدین کو کوئی اس طرح جمع کرسکتا ہے ہرگز نہیں یہ بات تلاوت قرآن ہی میں ہے کہ اس کی مشغولی میں تقلیل کلام بھی ہے اور ساتھ ساتھ گویائی کی قوت بھی حاصل ہوتی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ جو شخص اپنے کلام میں بلاغت پیدا کرنا چاہیے وہ تلاوت قرآن کثرت سے کیا کرے ۱۲ جامع) اب میں ایک مسئلہ تصوف کا مقام کے متعلق بیان کرکے شاید بیان کو ختم کردوں خدا نے آج وعظ کی لاج رکھ لی کہ پہلے بیانات کے تتموں سے وعظ طویل ہوگیا ورنہ تقلیل کلام کے متعلق زیادہ مضمون ذہن میں نہیں ہے یا یوں کہئے کہ تنگی وقت کی وجہ سے مضمون آتا نہیں کیونکہ اب دیر بہت ہوگئی ہے۔

تحلیہ اور تخلیہ

وہ مسئلہ یہ ہے کہ سلوک طریق کے دو جزء ہیں ایک تحلیہ (بالحاء المہملہ) دوسرے تخلیہ (بالخاء المعجمہ) تحلیہ کے معنی لغت میں آراستہ کرنا۔ اور اصطلاح صوفیاء میں تحلیہ یہ ہے کہ سالک اپنے کو اخلاق حمیدہ و تعلق مع اللہ سے آراستہ کرے جس کا طریقہ طاعات و ذکر میں مشغول ہونا ہے اور تخلیہ کے معنی لغت میں خالی کرنے کے ہیں اور اصطلاح میں سالک کا اپنے کو اخلاق رذیلہ سے پاک کرنا اور غیر سے تعلق منقطع کرنا ہے اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ سلوک کے تحلیہ اور تخلیہ دونوں کی ضرورت ہے لیکن اس میں اختلاف ہے کہ تحلیہ کو مقدم کیا جاوے یا تخلیہ کو، مشائخ میں دونوں طریقے مستعمل ہیں۔ بعض تحلیہ کو مقدم کرتے ہیں اسکے بعد تخلیہ کرتے ہیں بعض تخلیہ کو مقدم کرتے ہیں اس کے بعد تحلیہ کرتے ہیں اور ہر دونوں طریق سے کامیابی ہوتی ہے جیسے معالجات امراض جسمانیہ میں بھی یہ دونوں طریقے مستعمل ہیں حکماء یونان تخلیہ کو مقدم کرتے ہیں یعنی پہلے مادہ فاسد کو نکالتے ہیں بعد میں تقویت طبع کا اہتمام کرتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ جب تک مادہ فاسد کا اخراج نہ ہو اور مرض زائل نہ ہو اس وقت تک تقویت کی تمام تدبیریں بے کار ہیں۔ اس صورت میں اگر تم طبیعت کو قوت پہنچاؤ گے تو اس سے ممکن ہے کہ مرض کو قوت پہنچے۔ اس لیے طب یونانی میں بحالت مرض تقویت کی تدبیریں نہیں

کی جاتی۔ ہاں صحت کے بعد کوئی خمیرہ یا معجون وغیرہ قوت کے لیے کھلاتے ہیں یعنی تخلیہ کے بعد تحلیہ کرتے ہیں۔

حکماء یورپ اور حکماء یونان کا طریق علاج

اور حکماء یورپ کی رائے یہ ہے کہ مرض کی حالت میں سب سے پہلے تقویت طبع کا اہتمام کرنا چاہیے اگر اس میں دیر کی گئی اور ازالہ سبب مرض ہی پر صرف توجہ کی گئی اور تقویت طبع کا خیال نہ کیا گیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ازالہ سبب مرض تک طبیعت نہایت کمزور ہوجائے گی اور جب تک تم سبب کا ازالہ کرو گے اس وقت تک مریض ضعف طبع سے کہیں سے کہیں پہنچ جائے گا، پھر غایت ضعف کی حالت میں سنبھال دشوار ہوجائے گی اس لیے حکماء یورپ اول تقویت طبع (۱) کا اہتمام کرتے ہیں یعنی تحلیہ کو مقدم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تحلیہ سے تخلیہ خود ہوجاتا ہے یعنی جب طبیعت قوی ہوجاتی ہے تو وہ مرض کو خود زائل کردیتی ہے۔ حکماء یونان اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ضعف طبع کا سبب تو مرض ہی ہوا ہے اور اگر مرض اور سبب مرض کا ازالہ ہوگیا تو طبیعت خود قوی ہوجائے گی اور جب تک سبب ضعف موجود ہے اس وقت تک طبیعت کو قوت حاصل نہیں ہوسکتی اور اگر کسی تیز دوا سے قوت پہنچا بھی دی گئی تو وہ عارضی قوت ہوگی دیرپا نہ ہوگی قابل اعتبار وہی قوت ہے جو مانع کے ارتفاع کے (۲) بعد پیدا ہو۔ غرض طرفین سے دلائل بیان کیے جاتے ہیں اور دونوں طریقوں سے کامیابی ہوتی ہے۔ اجسام طبعیہ کے خواص میں نظر کرنے سے بھی دونوں کی تائید ہوتی ہے بعض خواص سے حکماء یونان کے قول کی تائید ہوتی اور بعض خواص سے حکماء یورپ کے قول کی۔

مثلاً جس بوتل میں پانی بھرا ہوا ہے اس میں اگر آپ ہوا بھرنا چاہیں تو جب تک پانی بھرا ہوا ہے اس وقت تک ہوا اس کے اندر نہیں پہنچ سکتی، پانی گرادو تو ہوا خود بخود بھر جائے گی۔ اس میں حکماء یونان کے قول کی تائید ہوتی ہے کہ تخلیہ کے بعد تحلیہ آسان ہوجاتا ہے جہاں ظرف کو غیر سے خالی کیا پھر اصلی حالت خود بخود عود کر آتی ہے اور اگر کسی بوتل میں ہوا بھری ہو اور آپ اس کو نکال کر پانی بھرنا چاہیں تو ہوا کو پہلے

(۱) طبیعت کو قوی کرنے کا اہتمام کرتے ہیں (۲) جو رکاوٹ دور ہونے کے بعد ہو۔

نکالنے کی ضرورت نہیں بلکہ بوتل میں پانی بھرنا شروع کرو بس ہوا ساتھ کے ساتھ خود نکلتی رہے گی۔ چنانچہ جس وقت بوتل منہ تک پانی سے بھر جائے گی اس وقت ہوا بالکل نہ رہے گی اس خاصیت سے حکماء حال کی تائید ہوتی ہے کہ تحلیہ سے تخلیہ خود بخود ہوجاتا ہے تخلیہ کو مقدم کرنے کی ضرورت نہیں تم تحلیہ شروع کرو طبیعت عوارض سے خود ہی خالی ہوتی چلی جائے گی۔ اسی طرح صوفیہ کی بھی رائے مختلف ہوگئی۔ بعض کے یہاں صفات حمیدہ اور تعلق مع اللہ پہلے پیدا کیا جاتا ہے پھر ذمائم (۱) کی اصلاح کی جاتی ہے اور بعض کے یہاں صفات رذیلہ (۲) اور تعلق غیر کو اول قطع کیا جاتا ہے پھر صفات حمیدہ اور تعلق مع اللہ پیدا کیا جاتا ہے اور ہر فریق نے اپنی تائید کے لیے قرآن سے بھی استنباط کیا ہے۔ فریق اول اس آیت کو اپنی تائید میں پیش کرتا ہے ''اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ''(۳) کہ اس آیت میں استعانت بالصبر کو مقدم کیا گیا ہے اور صبر کے معنی ہیں کف النفس عن المعاصی یعنی نفس کو معاصی سے روکنا اور یہی حاصل ہے تخلیہ کا اور استعانت بالصلوٰۃ کو مؤخر کیا گیا ہے جو کہ تحلیہ کی قسم میں سے ہے تو اس آیت میں تخلیہ کو تحلیہ پر مقدم کیا ہے۔

تحلیہ اور تخلیہ کی ساتھ ساتھ ضرورت

مگر اس میں قول فیصل یہ ہے کہ نہ تحلیہ کو مطلقاً مقدم کیا جائے نہ تخلیہ کو، بلکہ دونوں کو دوش بدوش (۴) لے چلنا چاہیے کہ ساتھ ساتھ تحلیہ وتخلیہ دونوں ہوتے رہیں اگر تحلیہ کو مطلقاً مقدم کیا گیا تو بعض دفعہ رذائل ایسے قوی ہوتے ہیں کہ سارا تحلیہ بیکار ہوجاتا ہے مثلاً کوئی شخص سر سے پیر تک پاخانہ میں بھرا ہو تو اس کے بدن پر عطر ملنا بے کار ہے وہ عطر کو بھی لے ڈوبے گا اسی طرح اگر تخلیہ کو مقدم کیا گیا تو اتنا زمانہ تحلیہ کی برکات سے خالی جائے گا پھر ممکن ہے کہ تخلیہ میں دیر لگ جائے اور کوتاہی عمر کی وجہ سے تحلیہ کی نوبت ہی نہ آئے تو یہ شخص تعلق مع اللہ سے بالکل ہی کورا ہوجائے گا۔ اس لیے محققین کی رائے اب یہ ہے کہ تحلیہ اور تخلیہ ساتھ ساتھ ہونا چاہیے۔ چشتیہ کے یہاں پہلے تخلیہ مقدم تھا اور اب بھی ان کو تحلیہ کے ساتھ تخلیہ کا اہتمام زیادہ ہوتا ہے مگر پہلے یہ حالت تھی کہ

(۱) برے اخلاق (۲) بری عادتوں (۳) ''اور صبر اور نماز سے سہارا حاصل کرو'' (۴) ساتھ ساتھ

برسوں مجاہدات کراتے تھے پھر مدت کے بعد بارہ تسبیح وغیرہ تعلیم کرتے اور نقشبندیہ پہلے ہی دن ذکر تعلیم کر دیتے تھے ان کے یہاں تخلیہ مقدم تھا بعد میں تخلیہ کراتے تھے، اب گو دونوں سلسلے کے محققین کی رائے بدل گئی مگر مذاق پر چشتیہ کے تخلیہ غالب ہے اور نقشبندیہ کے مذاق پر تحلیہ غالب ہے مگر باوجود اس کے اہل تربیت جو محقق ہیں اس میں طالب کے مذاق پر زیادہ مدار رکھتے ہیں جس کو وہ اپنی خداداد بصیرت سے تشخیص کر لیتے ہیں۔

حضرات نقشبندیہ و چشتیہ کا مذاق اختلاف

چنانچہ مولانا محمد منیر صاحب نانوتوی حضرت حاجی صاحب قدس سرہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیعت کے متعلق مشورہ لیا کہ میں چشتیہ سلسلہ میں داخل ہوں یا نقشبندیہ میں، حضرت حاجی صاحب نے ان سے فرمایا اچھا یہ بتلاؤ کہ اگر ایک زمین میں جھاڑ جھنکاڑ بکثرت کھڑے ہوں اور کوئی شخص اس میں تخم پاشی کرنا چاہیے(۱) تو اس کی بہتر صورت کیا ہے آیا اس کو اول جھاڑ جھنکاڑ صاف کرنا چاہیے اور بعد میں تخم پاشی کرے یا پہلے تخم پاشی کرے اور بعد میں جھاڑ جھنکاڑ کو صاف کرتا رہے۔ مولانا محمد منیر صاحب نے کہا کہ حضرت میری رائے میں تو تخم پاشی پہلے کر دینا چاہیے کچھ تو پیدا ہو جائے گا پھر جھاڑ جھنکاڑ کو بھی صاف کرتا رہے اگر اول جھاڑ جھنکاڑ وغیرہ کی صفائی میں لگ گیا تو ایسا نہ ہو کہ عمر اسی میں تمام ہو جائے اور تخم پاشی کی نوبت ہی نہ آئے۔ حاجی صاحب نے ہنس کر فرمایا کہ بس نقشبندیوں میں جاؤ تمہاری طبیعت کو اسی طریق ہی سے مناسبت ہے(۲)۔ یہ مذاق نقشبندیہ ہی کا ہے کہ جھاڑ جھنکاڑ کو بعد میں صاف کرے تخم پاشی پہلے کر دے، چشتیہ کا مذاق یہ ہے کہ وہ پہلے جھاڑوں کو صاف کرتے ہیں بعد میں تخم پاشی کرتے ہیں تو چشتیہ کا اصلی مذاق تو یہی ہے مگر اب زمانہ کی حالت اور عمر کی کوتاہی اور فراغ کی قلت پر نظر کر کے دونوں طریق کے محقق نے فیصلہ کر دیا ہے کہ دونوں کو دوش بدوش لے چلو یعنی زمین کو بھی تھوڑا تھوڑا صاف کرتے جاؤ اور جتنی زمین صاف ہوتی جائے اس میں تخم پاشی بھی کرتے جاؤ۔ ساری زمین کی صفائی کا انتظار نہ کرو تو اب الحمد للہ جو محقق ہیں وہ تخلیہ اور تحلیہ ساتھ ساتھ کرتے ہیں، چشتی اور نقشبندی دونوں طریقوں کو

(۱) بیج ڈالنا چاہے (۲) کیونکہ نقشبندی پہلے ذکر و تسبیح کی تعلیم دیتے ہیں پھر بری عادات کی اصلاح کرتے ہیں

ملا دیا بس وہ حال ہوگیا، مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ دونوں دریاؤں کو ساتھ ساتھ لے جارہے ہیں اب جس دن یہ شخص فارغ ہوگا نقشبندی ہوگا اور چشتی بھی دونوں طریق کا فاضل ہوگا اور یہ فیصلہ ایسا ہے جیسا مدرسین کے طرز میں پہلا اختلاف تھا کہ منقولات کو تعلیم میں مقدم کرنا چاہیے یا معقولات کو، بعض کی رائے یہ تھی کہ منقولات کو مقدم کرانا چاہیے کیونکہ وہ مقاصد ہیں اگر معقولات کو مقدم کیا گیا تو ایسا نہ ہو کہ پھر یہ شخص قلت فراغ یا قصر عمر کی وجہ سے منقولات (۱) سے محروم ہی رہ جائے تو یہ سارا زمانہ تعلیم کا بے کار ہی گیا کیونکہ یہ تو غیر مقصود کی تحصیل میں گزرا بعض کی رائے یہ تھی کہ معقولات کو مقدم کرنا چاہیے کیونکہ وہ مقدمات میں سے ہے اور اس سے عقل میں تیزی پیدا ہوتی ہے اور اس کی ضرورت مقاصد سے پہلے ہے جب اول عقل روشن ہوجائے گی تب مقاصد کا فہم آسان ہوگا، دوسرے اگر معقولات (۲) کو مؤخر کیا گیا تو اس میں ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ اس شخص پر رنگ معقول ہی کا غالب ہوگا کیونکہ جو رنگ اخیر میں چڑھتا ہے وہی غالب رہتا ہے اور اسی کا اثر طبیعت پر رہ جاتا ہے اور اگر منقول کو مؤخر کیا گیا تو اخیر میں اسی کا رنگ طبیعت پر غالب رہے گا۔ یہ تو ہر فریق کے دلائل تھے مگر علماء محققین نے اب فیصلہ کردیا ہے کہ یہ معقول کو علی الاطلاق مقدم کرو نہ منقول کو بلکہ دونوں کو دوش بدوش لے چلو اور معقول بقدر ضرورت پڑھاؤ منقول زیادہ پڑھاؤ اخیر میں اس شخص پر منقول ہی کا اثر غالب رہے گا اور ساتھ ساتھ معقولات پڑھنے سے فہم منقول میں مدد بھی ملے گی۔ چنانچہ اب مدارس میں اسی طریق پر عمل ہے یہ تو مسئلہ تھا۔

شریعت مقدسہ میں تمام مجاہدات کی رعایت

اب میں بتلانا چاہتا ہوں کہ جو بات محققین نے عرصہ دراز کے بعد طے کی ہے شریعت مقدسہ نے اس کو پہلے ہی طے کردیا ہے مگر اس پر کسی کی نظر نہیں پہنچی وہ یہ کہ شریعت نے تمام مجاہدات میں اس کی رعایت کی ہے کہ محض تخلیہ پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مجاہدہ کی صورت وہ تجویز کی جس میں تخلیہ اور تحلیہ ساتھ ساتھ ہوتا رہے۔ مثلاً تقلیل منام کی یہ صورت تجویز نہیں کی کہ رات کو خالی بیٹھے جاگا کرو بلکہ اس کو تراویح اور تہجد کی صورت میں

(۱) قرآن وحدیث (۲) علوم عقلیہ

تجویز کیا جس میں جاگنا بھی ہوگیا جو ترک راحت ہونے کی وجہ سے تخلیہ ہے اور ساتھ ساتھ عمل بھی ہوتا رہا جو تحلیہ ہے۔ اسی طرح تقلیل کلام کی یہ صورت تجویز نہیں کی کہ زبان کو بند کر کے بیٹھ جاؤ بلکہ اس کی یہ صورت تجویز کی تلاوت قرآن میں مشغول رہو اس میں زبان رذائل وذمائم سے بھی محفوظ ہوگئی۔ یہ تو تخلیہ تھا اور ساتھ ساتھ ذکر بھی ہو رہا ہے یہ تحلیہ ہے اور اس میں ایک بڑا راز ہے جس کے معلوم ہوجانے کے بعد ایک بہت بڑا خطرہ رفع ہوجائے گا جو سالکین کو پیش آتا ہے وہ خطرہ یہ ہے کہ بعض سالکین کو ترک تعلقات کا بے حد اہتمام ہوتا ہے اور اسی کے دقائق میں غور وفکر اور عمل کو لگائے رکھتا ہے مثلاً کسی نے اپنے ذمے بہت سے فضول کام لے رکھے تھے انہیں کم کر دیا، بازار کے کام کم کر دیئے، معاملات وتعلقات میل جول وغیرہ کو اس مصلحت سے گھٹا دیا کہ ان تعلقات کے کم ہونے سے تعلق مع اللہ پیدا ہو پھر قلب کو خالی کر کے متوجہ بحق ہو یہ نیت اچھی ہے اور مذاق چشتیہ کے موافق ہے مگر اس کے استعمال میں بعض دفعہ غلطی ہوجاتی ہے وہ یہ کہ تخلیہ اور تحلیہ دونوں ساتھ ساتھ تو تھے نہیں یعنی جس زمانہ میں یہ شخص تقلیل تعلقات غیر میں مشغول ہوتا ہے اس وقت تکثیر تعلق مع اللہ میں مشغول نہیں ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک وقت اس پر ایسا گزرتا ہے کہ اس کا دل بالکل خالی ہوجاتا ہے کہ نہ اس میں تعلق مع الخلق ہے نہ تعلق مع اللہ کیونکہ تعلق مع اللہ سے تو قلب کو بھرنے کا اس نے قصد ہی نہیں کیا یا قصد کیا ہو مگر اس کے لیے عمل تھوڑا کیا جو کافی نہیں ہوا اور تعلق مع اللہ چونکہ تعلق مع الغائب ہے اس لیے وہ ابھی ایسا قوی نہیں ہوا کہ دوسرے تعلقات کو دل سے نکال کر خود اس میں بھر جائے تو اس نے اپنے نزدیک مخلوق سے اپنے دل کو خالی کیا لیکن وہ اس وقت تعلق مع الحق سے بھی خالی ہے تو شیطان نے میدان خالی پا کر اپنا قبضہ جمالیا کیونکہ خالی میدان پر دشمن کا قبضہ آسانی سے ہوجاتا ہے اس کی ایسی مثال ہے کہ تم نے سپاہیوں کے واسطے ایک گاڑی خالی کرائی جس میں چمار بیٹھے تھے لیکن غلطی یہ کی چماروں کے اترنے کے ساتھ سپاہیوں کو بھرنا شروع نہ کیا بلکہ گاڑی کے خالی ہونے کا انتظار کیا اب جس وقت گاڑی چماروں سے خالی ہوگئی اور سپاہیوں سے بھی خالی تھی دشمن نے خالی دیکھ کر وہاں بستر جمالیا، تم کو چاہیے تھا کہ جو چمار اترتا جاتا اس کی جگہ ایک

سپاہی کو بٹھاتے جاتے تاکہ گاڑی خالی نہ ہوتی اور دشمن کو سہولت سے قبضہ کرنے کا موقع نہ ملتا اسی لیے بزرگوں نے لکھا ہے کہ بعض دفعہ تعلقات مباحہ بھی دل کے واسطے شیطان سے پہرہ دار ہوتے ہیں کیونکہ دل بھرا ہوا تو ہے گو تعلق مع اللہ سے نہ سہی تعلقات مباحہ ہی سے بھرا ہوا سہی مگر میدان خالی تو نہیں تو دشمن وہاں نہیں آسکتا اسی لیے وہ طالب کو نوکری چھوڑنے کی جلدی اجازت نہیں دیتے کیونکہ وہ دیکھتے ہیں کہ تعلق مع اللہ بھی ایسا قوی نہیں ہوا جو دل کو پر کردے اگر نوکری کا جائز تعلق بھی قلب سے نکل گیا تو دل بالکل خالی رہ جائے گا اور اس میں تشویشات پیدا ہوں گی جن کو ضعیف تعلق مع اللہ جو اس حالت میں ہے رفع نہیں کرسکتا۔ اسی لیے قلب کا بالکل خالی رہنا اچھا نہیں اس میں کچھ نہ کچھ ہونا چاہیے جبھی شیطان سے حفاظت ہوسکتی ہے جب تک تعلق مع اللہ سے قلب پُر نہیں ہوا ہو تو تعلق مع الخلق ہی سے پُر رہے بشرطیکہ وہ تعلق مباح ہو۔

قلب کا بالکل خالی ہونا اچھا نہیں

حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی یہی تحقیق ہے کہ جب تک تعلق مع اللہ قوی نہ ہو اس وقت تک تعلقات مباح کو ترک نہ کرو ایسا نہ ہو کہ زمین کو موروثی سے چھڑا لو اور خود بھی کھیتی نہ کرسکو تو زمین خالی دیکھ کر کوئی دشمن قبضہ کرکے دعویدار ہوجائے پہلے کسی کو کاشت کے واسطے مقرر کرلو پھر موروثی (۱) کو الگ کرنا۔ خلاصہ یہ کہ قلب کا بالکل خالی ہونا اچھا نہیں اب سمجھو کہ شریعت نے جو مجاہدات میں محض ترک پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ساتھ ساتھ عمل بھی مشروع کیا اس میں راز یہی ہے کہ اگر مجاہدہ میں صرف ترک پر اکتفا کیا جائے اور اس کے ساتھ کوئی عمل تعلق مع اللہ کے بڑھانے والا نہ کیا جائے تو نتیجہ مجاہدہ کا یہ ہوگا کہ قلب تعلقات غیر سے خالی ہونے کے ساتھ تعلق مع اللہ سے بھی خالی ہوگا اور اس صورت میں شیطان کا قلب پر قبضہ جمالینا آسان ہوجائے گا۔ اسی واسطے شریعت نے ہر مجاہدہ میں اس کی رعایت کی ہے کہ تعلقات مباحہ کو ترک کرکے اعمال میں مشغول کردیا ہے تاکہ قلب خالی نہ ہو، یہ مسئلہ شیخ ابن قیم رحمہ اللہ کی تقریر سے اول حل ہوا تھا حق تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے (انہوں نے اپنے کتاب الدواء الکافی میں یہ مضمون لکھا

(۱) ایسی زمین جس پر بارہ سال سے کاشت کرنے کی بنا پر کاشت کار اس کا مالک بن بیٹھا ہو

ہے) اس سے معلوم ہوا کہ ابن القیم رحمہ اللہ صوفی محقق تھے، خشک زاہد نہ تھے حق تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے عجیب بات لکھی۔

خلاصہ وعظ

اسی اصل پر میں کہتا ہوں کہ شریعت نے تقلیل کلام (۱) کی جو صورت تجویز کی ہے اس میں بھی اس راز کی رعایت ہے یعنی شریعت نے یہ نہیں کیا کہ روزے میں زبان بند کرلیا کرو کیونکہ اس سے صرف تعلق مع الخلق میں کمی ہوگی تعلق مع الحق (۲) میں کیا زیادتی ہوئی تو نتیجہ وہی ہوگا کہ دل دونوں سے خالی ہوجائے گا بلکہ یہ صورت تجویز کی کہ قرآن کی تلاوت میں مشغول رہو اس سے تعلق مع الخلق (۳) کی کمی کے ساتھ تعلق مع الحق بڑھتا رہے گا۔ اب دل خالی نہ ہوگا ایک چیز نکلے گی اور اس کی جگہ تعلق مع اللہ بھرے گا تو دل شیطان سے بالکل محفوظ رہے گا۔ بحمد اللہ ہر پہلو سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ شریعت نے مجاہدہ تقلیل کلام کی جو صورت نہیں ہوسکتی اس میں کوئی خطر کچھ بھی نہیں اور منافع بے شمار ہیں اور مجاہدہ عرفیہ جو تقلیل کلام کے لیے اہل ریاضت میں مستعمل ہے خطرہ سے خالی نہیں اور اس میں اتنے منافع بھی نہیں۔ اب میں ختم کرتا ہوں اور اس بیان کا نام ''تقلیل الکلام بصورۃ تلاوۃ کلام الملک العلام'' (۴) تجویز کرتا ہوں۔

دعا

اب دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ ہم کو رمضان میں تلاوت قرآن کی توفیق دیں اور تقلیل کلام کے ثمرات سے کامیاب فرماویں اور فہم سلیم عطا ہو آمین۔

وصلی اللّٰہ تعالیٰ علی خیر خلقه سیدنا محمد وعلیٰ اٰله واصحابه اجمعین۔ واخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمین (۵)

---

(۱) کم گوئی (۲) اللہ سے تعلق (۳) مخلوق سے تعلق (۴) کم گوئی بشکل تلاوت قرآن کریم (۵) اللہ تعالیٰ تمام قارئین کو مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

خلیل احمد تھانوی

۲۳ صفر ۱۴۴۱ھ/ ۲۳ اکتوبر ۲۰۱۹

أخبار الجامعة

محمد منیب صدیقی ادارۃ أشرف التحقیق۔ جامعہ دار العلوم الاسلامیۃ۔ لاھور

۱۔ ۱۶ جنوری ۲۰۲۰ء بروز جمعرات جامعہ اشرفیہ لاہور میں وفاق المدارس میں صوبائی سطح پر نمایاں پوزیشن حاصل کرنے والے طلباء کے مابین تقسیم انعامات کی تقریب کا انعقاد کیا گیا جہاں جامعہ دار العلوم الاسلامیہ کے طالب علم سعید الرحمان بن حافظ منظور احمد کو ثانویہ خاصہ ۲۰۱۵ء میں صوبائی سطح پہ وفاق المدارس میں دوم پوزیشن حاصل کرنے پر اعزازی شیلڈ سے نوازا گیا۔ نیز حضرت مہتمم صاحب کی خدمت میں وفاق المدارس العربیہ کی طرف سے حسن کارکردگی شیلڈ بھی پیش کی گئی۔ جو یقینا جامعہ اور معاونین جامعہ کے لیے ایک اعزاز کی بات ہے۔ فللہ الحمد و لہ المنۃ۔

۲۔ سکلر سکول، گبرگ لاہور میں طلباء کے درمیان منعقدہ مسابقہ قرائت میں (مؤرخہ ۱۵، ۱۸، ۲۰ جنوری) جامعہ کے مہتمم قاری احمد میاں تھانوی اور قاری رشید احمد تھانوی نے ججمینٹ کے فرائض سرانجام دیے۔

۳۔ جامعہ کے مہتمم حضرت قاری احمد میاں تھانوی دامت برکاتہم العالیہ ۲۸ جنوری سے ۹ روزہ دورہ قطر کے لیے روانہ ہوں گے جہاں مختلف تقاریب میں شرکت فرمائیں گے۔

۴۔ حضرت مولانا مشرف علی تھانویؒ کے ایماء پر شیخ عبد الحمید صاحب نے تقریبا ۳۰ مواعظ کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ لیکن بعض امور کی بنا پر اس وقت وہ تراجم شائع نہ ہوسکے۔ اب جامعہ کے نائب رئیس مولانا ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی صاحب نے ان کے شائع کرنے کا عزم کیا ہے اور پہلا وعظ ''استخفاف المعاصی'' ترتیب جدید کے ساتھ مرتب کرکے سابق امبیسڈر سید ابرار حسین صاحب سے تصحیح کروا کر شائع کیا جارہا ہے جس کا انگریزی عنوان ''FRIVOLOUS ATTITUDE TOWARDS SINS'' ہے۔ جو ان شاء اللہ اس ماہ میں منظر عام پر آجائیگا۔ اللہ رب العزت اکابرین جامعہ کی اس کاوش کو اور سید ابرار حسین صاحب کی کوشش کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت نصیب فرمائے اور اس سلسلہ کو تادیر قائم ودائم رکھے۔ آمین

۲۔ ملک کے معاشی احوال اور مہنگائی کی صورت حال سب کے سامنے ہے جس کے سبب جامعہ کے اخراجات بڑھ گئے ہیں، تمام متعلقین سے خصوصی دعاء کی درخواست ہے۔ اللہ تعالیٰ دین کی اس درسگاہ کی حفاظت فرمائے اور اپنے غیب کے خزانوں سے اسکی کفالت فرمائے۔ آمین